وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ وفاق المدارس ملتان

جلد نمبر: ۲۵ شمارہ نمبر: ۴ ربیع الثانی ۱۴۴۸ھ اکتوبر ۲۰۲۶ء

بیاد

شمس العلماء
حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء
حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر
حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام
حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول
حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین
حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین
حضرت مولانا عبدالرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم
سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 061-6514525-6514526-27 فیکس نمبر 061-6539485

Email:wifaqulmadaris@gmail.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ◉ مطبع: اقراء اختر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی ریلوے گیٹ ملتان

شائع کردہ: مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

مسلمانوں کے عائلی قوانین کا تحفظ	شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم	۳
۷ ستمبر یومِ ختمِ نبوت اور ہماری ذمہ داریاں	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم	۶
روڈ ٹو مکہ: پاکستان، سعودیہ اور ترکیہ کا دفاعی تعاون	سعادت منصور شیبانی	۱۰
قرآن کی معجز بیانی کا ایک نمونہ	ڈاکٹر عودہ خلیل ابوعودہ	۱۴
دجالی فتنہ کے خدوخال اور اس سے حفاظت کا طریقہ	محمد احمد حافظ	۱۸
شرح احادیث میں فکری منہج کی ضرورت و معنویت	عبدالوہاب سلطان دِیروی	۲۱
حضرت شیخ شمس الدین محمد بن احمد رملی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا جنید اشفاق انکی	۲۵
دینی مدارس میں تحقیقی کلچر کو فروغ دینے کی ضرورت	مولانا اسداللہ خان پشاوری	۴۰
اپنے جہل سے واقف ہوں	مولانا عبید اختر رحمانی	۴۹
شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سیف اللہ حقانیؒ	مولانا حافظ عرفان الحق حقانی	۵۲
درس نظامی کے طلبہ کرام کے لیے عربی شرحوں کی رہنمائی	مولانا عمر فاروق ڈیروی	۵۹
تبصرہ کتب	محمد احمد حافظ	۶۲

﴿مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں﴾

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر- سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر- ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 40 روپے، زرسالانہ مع ڈاک خرچ: 540 روپے

مسلمانوں کے عائلی قوانین کا تحفظ

مقننہ اور عدلیہ سے کچھ گزارشات

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

نکاح، طلاق، وصیت اور وراثت سے متعلق احکام ہر مذہب وملت میں تقریباً اسی تقدس کے حامل ہوتے ہیں جو عبادات کو حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن وسنت میں جتنی جزوی تفصیلات سے ان احکام کو بیان فرمایا گیا ہے، اس تفصیل سے کسی اور قانون کو بیان نہیں کیا گیا، کیونکہ ان قوانین کا تعلق اس خاندانی نظام سے ہے جو کسی تہذیب و تمدن کا بنیادی پتھر ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ چنانچہ انگریز نے جب برصغیر پر قبضہ جمایا، تو تمام قوانین اپنے طور پر نافذ کئے۔ لیکن مذکورہ قوانین کو مسلم پرسنل لاء کے طور پر برقرار رکھا، اور عدالتوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ ان معاملات میں فقہ حنفی یا فقہ جعفری کے مطابق فیصلے کریں۔ چنانچہ غیر منقسم ہندوستان میں عدالتیں اسکی پابند رہیں۔ اور شریعت کی تعبیر وتشریح میں یا تو مفتی حضرات کے فتووں پر اعتماد کرتیں، یا ان موضوعات پر لکھی گئی کتابوں سے استفادہ کرتی تھیں۔ اگرچہ بعض عدالتوں کے فیصلوں میں غلطیاں بھی ہوئیں، لیکن بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا پرسنل لاء بڑی حد تک محفوظ رہا۔

اسی دوران حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس فرمایا کہ بعض خواتین جو شوہروں کے ظلم کا شکار ہوتی ہیں۔ یا ان کی دماغی نااہلی یا گمشدگی وغیرہ کی بنا پر ان سے خلاصی حاصل نہیں کر پاتیں۔ انکے بارے میں حنفی فقہ میں عملی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے انہوں نے علما ہند سے مشورے کے بعد ان کی خلاصی کیلئے مالکی فقہ پر فتوی دیا، اور بعد میں اسی فتوے کی وجہ سے قانون تنسیخِ نکاح اسمبلی سے منظور ہوکر باقاعدہ قانونی شکل اختیار کر گیا۔ اس قانون کی خوبی یہ تھی کہ مظلوم بیوی کا نکاح بھی فسخ ہوجاتا تھا اور وہ مہر کی بدستور حق دار رہتی تھی۔

پاکستان کے آئین میں بھی شخصی قوانین (مسلم پرسنل لاء) کی اہمیت کو محسوس کر کے تقریباً ہر معاملے میں تمام مکاتب فکر کے اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے نکاح، طلاق اور وراثت کے معاملے میں اپنے اپنے مکتبِ فکر کے مطابق عمل کرتے رہیں۔ پاکستان کے جتنے دستور بنے ان میں اور بالآخر، ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی جو ابتک

نافذ ہے۔ تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کی جو دفعہ ۲۲۷ موجود ہے، اسمیں بھی یہ کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر پر وہ پرسنل لاء عائد کیا جائیگا جو اس مکتب فکر کے عقیدے کے مطابق ہو۔

پھر آئین کی دفعہ ۲۲۸ میں موجودہ قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق تبدیل کرنے کیلئے ایک اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی گئی ہے جو ہر مکتبِ فکر کے ایسے افراد پر مشتمل ہے جو قرآن وسنت کے علوم کے ماہر ہوں، اور ان کے مطابق قانون سازی میں پارلیمنٹ کی مدد کرسکیں۔

پھر آئین کی دفعہ 203 میں وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کی شریعت اپیلٹ بینچ اسی غرض کے لیے قائم کی گئی ہے کہ اس میں قرآن وسنت کا علم رکھنے والے ججز یہ فیصلہ کرسکیں کہ کونسا قانون قرآن وسنت کے مطابق یا مخالف ہے؟ اسکے لئے وسیع پیمانے پر حکومت اور عام مسلمانوں کا نقطۂ نظر سن کر اس پر جچا تلا فیصلہ دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔

اس کے اختیار پر بھی یہ قدغن لگائی گئی ہے کہ وہ مسلم پرسنل لاء کے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ نہ دے جو مسلمانوں کے کسی مکتب فکر کے خلاف ہو، جس کی تشریح سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ نے یہ کی ہے کہ ''اسکا مقصد مختلف مکاتب فکر کے اپنے عقیدے اور مسلک کے خلاف کسی قانون کو ختم نہیں کیا جاسکتا''، یعنی نکاح، طلاق اور وراثت کے بارے میں ہر مکتبِ فکر کا جو اپنا پرسنل لاء ہے اس مکتبِ فکر کو کسی دوسرے مکتب فکر کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ مثلاً شیعہ مکتبِ فکر کے لوگوں کو سنّی مکتبِ فکر کے احکام ماننے پر یا سنّی مکتبِ فکر کو شیعہ مذہب کے احکام ماننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فیصلہ شریعت اپیلیٹ بینچ کا کیا ہوا ہے جسکا ایک رکن راقم الحروف بھی تھا (ملاحظہ ہو اڈاکٹر محمود الرحمن فیصل بنام حکومت پاکستان پی ایل ڈی ۱۹۹۴ سپریم کورٹ ص ۶۰۷)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر چہ ہمارا آئین تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنانے کے بارے میں بالکل واضح ہے۔ لیکن خاص طور پر پرسنل لاء کے بارے میں وہ بہت حساس ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود افسوس ہے کہ ہماری مقننہ اور عدلیہ نے کچھ عرصے سے خاص طور پر مسلم پرسنل لاء کے بارے میں نہایت بے پروائی کا انداز اختیار کیا ہوا ہے۔ نکاح، طلاق اور وراثت کے بارے میں کوئی قانون نافذ کرنے سے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل سے رجوع کرنے کی بھی کوئی ضرورت سمجھی نہیں جارہی نہ قرآن وسنت کا علم رکھنے والوں کا موقف سمجھنے کی کوئی کوشش کی جارہی ہے، اسی روش کے نتیجے میں سندھ حکومت اور وفاقی حکومت نے ۱۸ سال سے کم عمر کی شادی کو خلافِ قانون قرار دیکر اس پر سزائیں عائد کردیں اور اسلام آباد ہائی کورٹ کی ایک

سنگل بنچ نے اسکو زنا بالجبر قرار دیدیا (پی ایل ڈی ۲۰۲۲ اسلام آباد ص ۲۲۸) اور یہ واضح نہ کیا کہ اس پر سزا دینے کے بعد نکاح باقی رہے گا انہیں؟ اسی طرح یہ قانون مزید ابہام اور غیر یقینی صورتحال کا شکار بن گیا۔

اسی طرح عدلیہ کی طرف سے ان معاملات میں ایسے فیصلے یکے بعد دیگرے آرہے ہیں جن میں نکاح، طلاق، خلع، مہر وغیرہ کے سلسلے میں قرآن وسنت سے آزاد ہوکر صرف اپنی سمجھ کی بنیاد پر ایسے فیصلے دیئے جارہے ہیں جو قرآن وسنت کے واضح احکام کے خلاف ہیں اور اس پر اظہار افسوس ہی کیا جاسکتا ہے کہ جس سمجھ کی بنیاد پر یہ فیصلے کئے جارہے ہیں، دو بڑی حد تک مغربی پروپیگنڈے سے متاثر ہے جس نے مغرب میں خاندانی نظام کی چُولیں ہلا کر رکھدی ہیں، اس قسم کے فیصلے دینے سے پہلے متعلقہ موضوع پر مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں کو سننے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی۔ اس طرح ہم مسلم پرسنل لاء کے معاملے میں ان حقوق سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں جو انگریزی حکومت میں مسلمانوں کو حاصل تھے۔

ہماری نظر میں مقننہ اور عدلیہ کا یہ طرزِ عمل ہمارے آئین کی مجموعی اسکیم اور اس کی بنیادی روح کے خلاف ہے جسمیں قدم قدم پر مسلمانوں کے پرسنل لاء کا تحفظ کیا گیا ہے۔

یہ گزارشات ہم نہایت دردمندی اور دل سوزی سے مقننہ اور عدلیہ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں کہ اسلامی قوانین کے نفاذ میں پیش قدمی کرنے کے بجائے جن قوانین کو خود آئین نے تحفظ دیا ہے، ان کو ختم کرنے کا رویہ ہمیں اسلامی نقطۂ نظر سے پیچھے دھکیل رہا ہے۔ خدا کیلئے اس طرز عمل سے باز آئیں، اور جہاں قرآن وسنت کی راہنمائی ضروری ہے، انکو آئینی اداروں اسلامی نظریاتی کونسل وفاقی شرعی عدالت اور شریعت اپیلیٹ بینچ کے حوالے کردیں۔ اور اس قسم کے مسائل پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو تفصیل کے ساتھ سن کر کوئی اقدام کریں۔ اس معاملے میں ہم سیاسی جماعتوں اور وکلاء برادری سے بھی یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کے مقدمات میں بیدار رہیں، اور علماء کرام کی مشاورت سے ایسے مقدمات میں صحیح شرعی صورت حال مقننہ اور عدلیہ کے سامنے پیش کریں۔

بہتر یہ ہے کہ اس معاملے کو آئینی دائرے میں رہ کر حل کرلیا جائے اور عوامی احتجاج اور انتشار کا ذریعہ بننے سے پہلے اس کا سدّباب کرلیا جائے۔

۷ ستمبر یومِ ختمِ نبوت اور ہماری ذمہ داریاں

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری دامت برکاتہم العالیہ

ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

7 ستمبر پاکستان اور عالمِ اسلام کی تاریخ کا ایک عظیم اور یادگار دن ہے۔ یہ دن عقیدۂ ختمِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تحفظ کے حوالے سے مسلمانوں کی طویل دینی، علمی، عوامی اور آئینی جدوجہد کی یاد دلاتا ہے۔ یہ دن ہمیں صرف ایک تاریخی واقعہ یاد نہیں دلاتا بلکہ یہ اس حقیقت کی یاددہانی بھی کراتا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے بنیادی عقیدے کے تحفظ کے لیے ہمت، اتحاد، حکمت اور پُرامن جدوجہد کے ساتھ کھڑی ہوجائے تو وہ تاریخ کا رخ بدل سکتی ہے۔

برصغیر میں فتنۂ قادیانیت کے آغاز ہی سے علماء کرام نے اس کا علمی اور فکری محاسبہ کیا۔ علامہ انور شاہ کشمیری سے لے کر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد علی جالندھری تک کتنے اکابر نے اپنی زندگیاں عقیدہ ختم نبوت اور مسلمانوں کے ایمان کے تحفظ کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد بھی خصوصاً 1953ء کی تحریکِ ختمِ نبوت نے اس مسئلے کو قومی سطح پر نمایاں کیا۔ اس تحریک میں علماء کرام، دینی جماعتوں اور عوام نے بھرپور کردار ادا کیا اور بے پناہ قربانیاں دیں اگرچہ اس تحریک میں مسلمانوں کا بنیادی مطالبہ پورا نہ ہوسکا، لیکن یہ مسئلہ قومی شعور کا مستقل حصہ بن گیا۔

پھر 1974ء میں ایسے حالات پیدا ہوئے جنہوں نے تحریکِ ختمِ نبوت کو ایک مرتبہ پھر ملک گیر سطح پر زندہ کر دیا۔ 1974ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلبہ کا ایک گروپ تعلیمی وتفریحی سفر پر روانہ ہوا۔ سفر کے دوران 22 مئی 1974ء کو ان کی ٹرین چناب نگر کے ریلوے اسٹیشن پر رکی، چناب نگر جسے اس وقت ربوہ کہا جاتا تھا اور قادیانیوں نے اس شہر کو سرفرانسس موڈی سے کوڑیوں کے بھاؤ لیز پر لے کر اس خطے میں اسرائیلی طرز کی ایک منی ریاست قائم کر لی تھی۔ پہاڑوں میں گھرے اس شہر میں قادیانیوں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ کے سفر پر جاتے ہوئے کچھ تلخی اور کشیدگی ہوئی تھی، چنانچہ واپسی پر 29 مئی 1974ء کو باقاعدہ جاسوسی اور پیشگی منصوبہ بندی کر کے قادیانی غنڈوں نے معصوم طلبہ پر بہیمانہ تشدد کیا، زخمی اور مظلوم طلبہ کی ٹرین جب فیصل آباد پہنچی تو

اس واقعے کی خبر پہلے ہی شہر اور گردونواح میں پھیل چکی تھی۔

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے رہنما مولانا تاج محمود صاحب دیگر علماء اور عوام کی بڑی تعداد کے ہمراہ طلبہ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ان طلبہ کی حالت دیکھ کر ہر مسلمان دکھی ہوا،ان کو تسلی دی گئی ،ان کی مرہم پٹی اور علاج معالجہ کیا گیا۔

اس واقعے کے خلاف عوامی ردعمل کا آغاز فیصل آباد سے ہوا یہاں سے تحریک نے تیزی کے ساتھ پنجاب کے دوسرے شہروں اور پھر پورے ملک میں وسعت اختیار کی۔چناب نگر کے واقعے کے بعد پاکستان کے مختلف شہروں میں جلسے،اجتماعات اور احتجاجی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔علماء کرام،دینی جماعتوں اور عوام نے اس مسئلے کو قومی سطح پر اٹھایا۔

بنیادی طور پر یہ تحریک عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم سے شروع ہوئی تھی اور اس کی قیادت محدث عصر علامہ سید محمد یوسف بنوری کر رہے تھے لیکن بہت جلد یہ تحریک کسی ایک طبقے یا ایک جماعت تک محدود نہیں رہی بلکہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء اور دینی قیادت ایک مشترکہ مقصد پر جمع ہوئے یہی اس تحریک کی سب سے بڑی قوت تھی کہ عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کے لیے مختلف دینی جماعتیں اور مکاتبِ فکر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔

ملک بھر میں عوام کا بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ قادیانیوں کی مذہبی اور آئینی حیثیت کے مسئلے کو واضح طور پر طے کیا جائے۔علماء کرام اور قائدین نے عوام کے جذبات کی رہنمائی کی اور تحریک کو ایک منظم سمت دینے کی کوشش کی۔

1974ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں پاکستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء اور دینی قائدین نے اہم کردار ادا کیا۔ان اکابر میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ،مولانا مفتی محمودؒ،مولانا عبدالحقؒ،مولانا غلام غوث ہزارویؒ،مولانا شاہ احمد نورانیؒ،مولانا عبدالحکیم،پروفیسر غفور احمد اور دیگر متعدد دینی و سیاسی رہنما شامل تھے۔ملک میں بڑھتے ہوئے عوامی دباؤ اور تحریک کے پھیلاؤ کے بعد حکومت نے اس مسئلے کو قومی اسمبلی کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔یہ پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کا ایک غیر معمولی مرحلہ تھا۔قومی اسمبلی نے اس معاملے پر تفصیلی کارروائی کی۔اس سلسلے میں قادیانی جماعت کے نمائندوں کو بھی اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دیا گیا اور ارکانِ اسمبلی نے مختلف سوالات کے ذریعے ان کے عقائد اور موقف کو سمجھنے کی کوشش کی۔

یہ کارروائی کئی نشستوں پر مشتمل تھی اور اس میں پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کے ایک انتہائی حساس مذہبی اور آئینی مسئلے کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔علماء اور دینی قیادت کی علمی معاونت،پارلیمنٹ کے اندر مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کی کوششوں اور مختلف سیاسی حلقوں کی مشاورت کے بعد معاملہ ایک تاریخی فیصلے کی طرف بڑھا۔

مولانا مفتی محمودؒ صاحب،مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب،مولانا شاہ احمد نورانی صاحب،مولانا عبدالحق صاحب،مولانا عبدالحکیم صاحب،پروفیسر غفور احمد صاحب سمیت دیگر دینی و سیاسی رہنماؤں نے اس مرحلے پر

نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان کی علمی استعداد، دینی بصیرت اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے حوالے سے واضح موقف نے پارلیمانی کارروائی میں امتِ مسلمہ کے مؤقف کو مضبوط انداز میں پیش کرنے میں مدد دی۔

بالآخر 7 ستمبر 1974ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک تاریخی آئینی ترمیم منظور کی۔ اس فیصلے کے ذریعے قادیانیوں اور لاہوریوں کو آئینی طور پر غیر مسلم قرار دیا گیا۔ یہ فیصلہ پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم آئینی سنگِ میل تھا۔ اس حوالے سے صرف علماء کرام اور مذہبی کارکنوں نے ہی کردار ادا نہیں کیا بلکہ اس وقت کے وزیر اعظم قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ اور اٹارنی جنرل یحیٰ بختیار تک مختلف شخصیات اور مختلف طبقات کے لوگوں نے جو کردار ادا کیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

اس موقع پر ہمارے صدر وفاق شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ اور حضرت مولانا سمیع الحق شہید رحمہ اللہ نے علمی، تحقیقی اور تحریری حوالے سے گرانقدر خدمات سرانجام دیں جبکہ عالمی مجلس ختم نبوت کے رہنماوں مولانا محمد حیات، مولانا تاج محمود، مولانا محمد شریف جالندھری اور مولانا عبدالرحیم اشعر صاحب نے قادیانی کتب سے حوالہ جات اور مواد کی تلاش میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔

اس کامیابی کے پیچھے کسی ایک فرد یا ایک جماعت کی کوشش نہیں تھی بلکہ اس میں علماء کرام، دینی جماعتوں، سیاسی قیادت اور عام مسلمانوں کی طویل جدوجہد شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 7 ستمبر کو یومِ تحفظِ ختمِ نبوت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے

7 ستمبر کا دن صرف ماضی کے واقعات دہرانے کا دن نہیں۔ یہ دن ہم سے سوال کرتا ہے کہ: کیا ہم اپنے بنیادی عقائد کو صحیح طور پر جانتے ہیں؟ کیا ہماری نئی نسل عقیدۂ ختمِ نبوت کی اہمیت سے واقف ہے؟ کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اپنی عملی زندگی میں ظاہر کر رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے ایمان کے تحفظ کے لیے علم اور حکمت کے ساتھ تیار ہیں؟ یومِ ختمِ نبوت کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ عقیدۂ ختمِ نبوت کو محض ایک جذباتی نعرے کے طور پر نہ لے بلکہ قرآن وسنت اور مستند اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اسے صحیح طور پر سمجھے۔ علم کے بغیر عقیدے کا دفاع مضبوط نہیں ہوسکتا۔

آج ہماری سب سے بڑی ذمہ داری اپنی نئی نسل کی تربیت ہے۔ ہمارے گھروں، مدارس، مساجد اور تعلیمی اداروں میں بچوں اور نوجوانوں کو عقیدۂ ختمِ نبوت کی اہمیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور سیرتِ طیبہ سے روشناس کرایا جائے۔ 1974ء کی تحریک کا سب سے بڑا سبق اتحاد ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء اور قائدین نے اپنے باہمی اختلافات کے باوجود عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کے لیے ایک مشترکہ موقف اختیار کیا۔ آج بھی ہمیں اسی جذبۂ اتحاد کی ضرورت ہے۔ آیئے! آج ہم یہ عہد کریں کہ عقیدۂ ختمِ نبوت پر کامل ایمان کے ساتھ قائم رہیں

گے۔ہم اپنی نسل نو کو اس عقیدے سے روشناس کرائیں گے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور سنت کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں گے۔نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ کے واقعے سے پیدا ہونے والی صورتحال، فیصل آباد سے اٹھنے والی عوامی آواز، ملک گیر تحریک، اکابر علماء کی قیادت، مولانا مفتی محمودؒ اور دیگر پارلیمانی نمائندوں کی جدوجہد، اور پھر قومی اسمبلی کی تاریخی کارروائی، یہ سب واقعات مل کر 7 ستمبر کی تاریخ کو ایک عظیم قومی اور دینی باب بناتے ہیں۔ختمِ نبوت کا تحفظ صرف ایک دن کی بات نہیں، بلکہ ہر مسلمان کے ایمان، علم، کردار اور اپنی نسلوں کی تربیت سے وابستہ ایک مستقل ذمہ داری ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں عقیدۂ ختمِ نبوت پر کامل ایمان کے ساتھ زندگی گزارنے، رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت نصیب فرمانے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کرنے اور اپنی نسلوں کے ایمان کی حفاظت کی ذمہ داری صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

بقیہ: شرحِ احادیث میں فکری منہج کی ضرورت ومعنویت

کتاب مگر ٹھیٹھ عربی اسلوب میں ہے، عموماً مدارس کے فضلاء عربی مطالعہ میں دلچسپی کے فقدان کے باعث مستفید نہیں ہوتے، فن کے مدرسین اس سے ضرور خوشہ چینی کرتے ہوں گے، شیخ اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ تعالی کی تلخیص ''تکملہ فتح الملہم'' اس کتاب کی قدردانی کی نقشِ جاوید ہے۔ جدید اردو داں طبقہ دانشوراں کو بھی اس عظیم کتاب کی اہمیت کا چنداں احساس نہیں، عالم عرب کے علمی فکری حلقوں میں البتہ خوب اس کا چرچا ہوا ہے، بلکہ ترکی وغیرہ کے بعض مدارس میں داخل نصاب بھی ہے۔

اگر حدیث کی تدریس صرف احکام کی تفہیم تک محدود رہے تو اس کی افادیت کا ایک بڑا حصہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔یہاں حدیث کو اس کے فکری اور تمدنی تناظر میں پڑھا جاتا ہے۔غالباً یہی وہ سمت ہے جس کی طرف ''تکملہ فتح الملہم'' کے علمی منہج نے خاموشی کے ساتھ ایک مضبوط علمی اشارہ دیا ہے۔بہرحال، اس پہلو پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اللہ کرے اہلِ علم وفضل اس جانب توجہ مبذول فرما کر ہم طلبہ کو مستفید فرما سکیں۔

روڈ ٹو مکہ: پاکستان، سعودیہ اور ترکیہ کا دفاعی تعاون

ایک نئے علاقائی نظم کی امید

سعادت منصور شیبانی

دنیا کی سیاست میں بعض فیصلے محض معاہدے نہیں ہوتے، وہ آنے والے زمانے کی سمت کا تعین بھی کرتے ہیں۔ پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان مکہ مکرمہ میں طے پانے والا مشترکہ دفاعی معاہدہ بھی بلاشبہ انہی اہم پیش رفتوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

سات اگست 2026ء کو ہونے والے اس معاہدے نے تین اہم مسلم ممالک کو ایک ایسے دفاعی فریم ورک میں جمع کیا ہے جس کی بنیاد باہمی دفاع، مشترکہ سلامتی اور ایک دوسرے کی خودمختاری کے احترام پر رکھی گئی ہے۔ معاہدے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تینوں میں سے کسی ایک ملک پر مسلح حملہ تینوں کے خلاف حملہ تصور کیا جائے گا۔

یہ معاہدہ ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب مشرقِ وسطیٰ شدید کشیدگی، جنگی خطرات اور علاقائی عدم استحکام کی کیفیت سے دوچار ہے۔ ایسے ماحول میں کسی بھی ریاست کے لیے اپنی سلامتی کے بارے میں ازسرِنو غور کرنا ایک فطری امر ہے۔ تاہم اس معاہدے کی اصل اہمیت صرف یہ نہیں کہ تین ممالک نے اپنے دفاع کو باہم مربوط کرنے کا فیصلہ کیا ہے؛ اصل اہمیت یہ ہے کہ مسلم دنیا کے تین بااثر ممالک نے اپنی اجتماعی صلاحیتوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس معاہدے کے بارے میں سب سے اہم بات خود اس کے فریقین کی وضاحت ہے کہ یہ کسی مخصوص ملک کے خلاف قائم کیا گیا اتحاد نہیں۔ ترکیہ کے وزیر خارجہ ہاکان فیدان نے واضح کیا کہ معاہدہ ایران یا کسی دوسرے ملک کے خلاف نہیں بلکہ دفاعی نوعیت رکھتا ہے۔

یہ وضاحت اس معاہدے کی روح کو سمجھنے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ دنیا میں مضبوط دفاع کا مقصد لازماً جنگ نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی مضبوط دفاع ہی جنگ کا سب سے مؤثر سدِ باب بن جاتا ہے۔ جب کسی جارح قوت کو یہ یقین ہو کہ کسی ملک کو تنہا کر کے دباؤ میں لانا ممکن نہیں تو جارحیت کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اجتماعی دفاع اگر ذمہ داری، ضبط اور سفارت کاری کے ساتھ قائم کیا جائے تو وہ جنگ کو ہوا دینے کے بجائے جنگ روکنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اسی لیے پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے اس تعاون کو کسی نئے محاذ آرائی کے آغاز کے بجائے امن اور استحکام کے ایک ذمہ دار نظام کے طور پر آگے بڑھائیں۔

تین ممالک، تین مختلف مگر متحد قوتیں:

اس شراکت داری کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ تینوں ممالک کی صلاحیتیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ پاکستان کے پاس طویل عسکری تجربہ، ایک منظم مسلح افواج، دفاعی پیداوار کی اپنی بنیاد اور پیچیدہ سلامتی کے ماحول میں کام کرنے کا وسیع تجربہ ہے۔ ترکیہ نے گزشتہ برسوں میں اپنی دفاعی صنعت کو نمایاں طور پر ترقی دی ہے۔ ڈرونز، ایوی ایشن، بحری ٹیکنالوجی، الیکٹرانک جنگ، دفاعی مواصلات اور دیگر شعبوں میں ترکیہ کی پیش رفت اسے اس شراکت داری کا ایک اہم ٹیکنالوجیکل ستون بناتی ہے۔ دوسری طرف سعودی عرب کے پاس معاشی وسائل، توانائی کی قوت اور عرب و اسلامی دنیا میں غیر معمولی سیاسی و مذہبی اہمیت ہے۔ اگر ان تینوں ممالک کی قوتیں محض فوجی مشقوں تک محدود رہنے کے بجائے تحقیق، ٹیکنالوجی، دفاعی صنعت، سائبر سکیورٹی، مصنوعی ذہانت، فضائی دفاع اور مشترکہ پیداوار کے منصوبوں میں ڈھل جائیں تو اس تعاون کے اثرات بہت دور تک جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 31 اگست کو استنبول میں ہونے والے پہلے اجلاس میں دفاعی صنعت، ٹیکنالوجی اور مشترکہ پیداوار کے شعبوں میں تعاون بڑھانے پر توجہ دی گئی۔ تینوں ممالک نے معاہدے کو مزید ادارہ جاتی شکل دینے کے لیے سعودی عرب میں ایک مستقل سیکرٹریٹ قائم کرنے پر بھی اتفاق کیا۔

پاکستان کے لیے ایک غیر معمولی موقع:

اس نئی شراکت داری میں پاکستان کے لیے امکانات بہت وسیع ہیں۔ پاکستان ایک طرف سعودی عرب کے ساتھ اپنے دیرینہ برادرانہ اور دفاعی تعلقات رکھتا ہے اور دوسری طرف ترکیہ کے ساتھ بھی گزشتہ برسوں میں دفاعی، سفارتی اور معاشی تعلقات میں نمایاں وسعت آئی ہے۔ اب ان دونوں تعلقات کو ایک مشترکہ فریم ورک میں لانے کا موقع پاکستان کو حاصل ہوگیا ہے۔ لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے محض جذبات کافی نہیں ہوں گے؛ حکمتِ عملی، ادارہ سازی اور معاشی منصوبہ بندی ضروری ہوگی۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ دفاعی تعاون کو اپنی دفاعی صنعت کے فروغ سے جوڑے۔

ترکیہ کی جدید ٹیکنالوجی اور سعودی عرب کے سرمایہ جاتی وسائل کے ساتھ مل کر مشترکہ دفاعی منصوبے تشکیل دیے جاسکتے ہیں۔ پاکستان میں مشترکہ تحقیقاتی مراکز، دفاعی صنعتی زونز اور جدید ٹیکنالوجی کے منصوبے قائم ہوسکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ معاہدہ پاکستان کے لیے صرف سلامتی کا حصار نہیں رہے گا بلکہ معاشی اور صنعتی ترقی کا ایک نیا دروازہ بھی بن سکتا ہے۔

مسلم دنیا کے لیے ایک بڑا سبق:

اس معاہدے کی سب سے امید افزا جہت مسلم دنیا کے باہمی تعاون کا امکان ہے۔ مسلم ممالک کے پاس انسانی وسائل بھی ہیں، قدرتی وسائل بھی، جغرافیائی اہمیت بھی اور بے پناہ معاشی امکانات بھی؛ لیکن ان کی سب سے بڑی کمزوری اکثر باہمی عدم اعتماد، سیاسی تقسیم اور مشترکہ اداروں کا فقدان رہی ہے۔ پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ اگر اپنے باہمی دفاعی تعاون کو کامیاب بناتے ہیں تو یہ مسلم دنیا میں ایک نئے تصور کو جنم دے سکتا ہے:

''اختلافات کے باوجود مشترکہ مفادات پر تعاون''۔

یہی جدید دنیا کا اصول بھی ہے۔ یورپ کی ریاستیں تاریخی جنگوں کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ اقتصادی اور سیاسی تعاون کر سکتی ہیں تو مسلم ممالک اپنے باہمی اختلافات کے باوجود امن، تجارت، دفاع، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کیوں نہیں مل بیٹھ سکتے؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تعاون کو کسی مسلکی یا گروہی تقسیم کے عنوان سے نہ دیکھا جائے۔ اسے اسلامی دنیا میں امن، خود اعتمادی اور باہمی تعاون کی ایک مثبت مثال بننا چاہیے۔

مکہ کی نسبت اور اس کی ذمہ داری:

یہ بھی ایک غیر معمولی امر ہے کہ اس معاہدے کا آغاز مکہ مکرمہ سے ہوا۔ مکہ صرف ایک جغرافیائی مقام نہیں؛ وہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے وحدت، عبادت اور امن کی علامت ہے۔ اس لیے مکہ سے شروع ہونے والے اس دفاعی تعاون کی سب سے خوب صورت تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی منزل جنگ نہیں بلکہ امن ہو، اس کا مقصد غلبہ نہیں بلکہ تحفظ ہو، اور اس کی روح دشمنی نہیں بلکہ باہمی تعاون ہو۔ اگر مکہ کے نام سے منسوب یہ معاہدہ دنیا کو یہ پیغام دے کہ مسلم ممالک اپنی طاقت کو ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ اپنے عوام کے تحفظ، خطے کے استحکام اور امن کے فروغ کے لیے استعمال کریں گے تو یہ اس معاہدے کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ دفاعی قوت کے ساتھ سفارتی قوت بھی ضروری ہے۔ یہاں ایک اہم حقیقت نظر انداز نہیں کی جانی چاہیے:

''صرف عسکری قوت دیرپا امن کی ضمانت نہیں۔''

دنیا کی بڑی طاقتوں کے تجربات بتاتے ہیں کہ دفاعی صلاحیت کے ساتھ مؤثر سفارت کاری، معاشی استحکام، مضبوط ادارے اور سیاسی بصیرت بھی ناگزیر ہیں۔ پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کو چاہیے کہ دفاعی تعاون کے ساتھ ایک مضبوط سفارتی رابطہ کاری کا نظام بھی قائم کریں۔ علاقائی بحرانوں کے حل، جنگ بندی، انسانی امداد، دہشت گردی کے خاتمے اور تنازعات کے پرامن حل کے لیے مشترکہ سفارتی کوششیں کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح یہ

شراکت داری محض فوجی قوت کا اظہار نہیں بلکہ ذمہ دار علاقائی قیادت کی علامت بن سکتی ہے۔

اگلا مرحلہ: الفاظ سے عمل تک:

معاہدے پر دستخط ایک آغاز ہیں، منزل نہیں۔ اصل امتحان اب شروع ہوا ہے۔ تینوں ممالک کو چاہیے کہ مشترکہ دفاعی منصوبوں کے لیے واضح ٹائم لائن مقرر کریں، مستقل ادارے قائم کریں، مشترکہ فوجی مشقوں کو منظم کریں، انٹیلی جنس اور اطلاعات کے تبادلے کے مؤثر نظام بنائیں، دفاعی صنعت میں مشترکہ منصوبے شروع کریں اور نوجوان سائنس دانوں و انجینئروں کے لیے مشترکہ تحقیقی پروگرام تشکیل دیں۔ 31 اگست کے اجلاس میں مستقل سیکرٹریٹ کے قیام کا فیصلہ اسی سمت ایک اہم قدم ہے۔ معاہدے کے تحت اس ادارے کی ابتدائی قیادت پاکستان کے ایک سیکرٹری جنرل کے پاس تین سال کے لیے رہنے کا فیصلہ بھی سامنے آیا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ادارہ محض اجلاسوں اور اعلامیوں تک محدود نہ رہے بلکہ عملی منصوبہ بندی کا مرکز بنے۔ ایک نئے علاقائی نظم کی بنیاد؟ آج دنیا میں پرانے اتحاد اپنی جگہ برقرار ہیں لیکن نئے علاقائی تعاون بھی سامنے آ رہے ہیں۔ ایسے وقت میں پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان دفاعی تعاون کو ایک اہم علاقائی تجربے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تجربے کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ تینوں ممالک اسے کس قدر وسیع النظر، متوازن اور تعمیری بناتے ہیں۔ اگر یہ معاہدہ صرف ہتھیاروں اور فوجی طاقت تک محدود رہا تو اس کی افادیت محدود ہوگی۔ لیکن اگر اس کے ذریعے دفاعی خود کفالت، ٹیکنالوجی، صنعت، تجارت، سفارت کاری، انسانی ترقی اور علاقائی امن کے نئے دروازے کھولے گئے تو اس کے اثرات نسلوں تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے سامنے ایک تاریخی موقع ہے۔ وہ چاہیں تو ایک ایسا دفاعی بندوبست تشکیل دیں جو صرف تین ملکوں کی حفاظت کرے؛ اور وہ چاہیں تو اسے ایک ایسے وسیع تر تعاون کی بنیاد بنا دیں جو پورے خطے میں امن، استحکام اور خود انحصاری کی نئی روح پیدا کرے۔

مکہ سے اٹھنے والی یہ آواز جنگ کی نہیں، امن کی آواز ہونی چاہیے؛ طاقت کے اظہار کی نہیں، ذمہ داری کے احساس کی آواز ہونی چاہیے۔ اگر تینوں ممالک اپنی طاقت کو دانش کے ساتھ، اپنی خودمختاری کو باہمی احترام کے ساتھ، اور اپنے دفاع کو امن کے مقصد کے ساتھ جوڑ سکیں تو مکہ کا یہ معاہدہ تاریخ میں محض ایک دفاعی معاہدے کے طور پر نہیں بلکہ مسلم دنیا میں تعاون، خود اعتمادی اور پُرامن علاقائی شراکت داری کے ایک نئے باب کے طور پر یاد کیا جا سکتا ہے۔ اور شاید یہی اس معاہدے کی سب سے بڑی معنویت ہے:

مضبوط بنو، مگر جنگ کے لیے نہیں؛ متحد ہو، مگر کسی کے خلاف نہیں؛ اور طاقت حاصل کرو، تاکہ امن کی حفاظت کر سکو۔

قرآن کی معجز بیانی کا ایک نمونہ

تحریر: ڈاکٹر عودہ خلیل ابوعودہ

ترجمانی: مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۔۔۔۔اس آیت میں اللہ تبارک وتعالی نے اہلِ ایمان کے لیے جس محبوبیت کا وعدہ فرمایا ہے وہ ہے ''وُدّ''۔محبت ومحبوبیت کے جتنے درجات ہوسکتے ہیں ان میں سب سے اعلیٰ ورفع درجہ ''وُدّ'' کا ہے،لغت کی کتابوں نے اس کو تمناؤں کے درجے تک پہنچادیا ہے،اس کا فعل آتا ہے''وَدَّ الشَّیْءَ یَوَدُّہٗ (یَوَدُّہٗ) وُدًّا وَوَدًّا وَوِدَادًا وَمَوَدَّۃً'' یعنی آدمی کسی سے ایسی محبت کرے کہ اس سے زیادہ کی پھر گنجائش نہ ہو،''وُدّ'' کا مرحلہ انسان کے احساسات تک کو اپنا اسیر بناتا ہے اور اس کے افکار پر بھی غالب اور حاوی ہوجاتا ہے،''حُبّ'' اس راہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا پہلا زینہ۔''حُبّ'' کے ابتدائی مرحلے اور''وُدّ'' کے انتہائی مرحلے کے بیچ محبت کے جذبات اور احساسات کے لیے عربوں نے بہت سے درجات رکھے ہیں، چناں چہ عربی زبان میں''حُبّ'' (محبت) کا پہلا درجہ''الھویٰ'' ہے جس میں انسان کے اندر اپنے نفس کی طرف کچھ رجحان اور اپنی ذات کی طرف کچھ میلان پایا جاتا ہے،حق تعالی کا ارشاد ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم:3۔4)

''اور وہ خواہشِ نفس سے نہیں بولتے، یہ (قرآن) تو حکمِ خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔''

اس کے بعد محبت کا جو مرحلہ آتا ہے اس کے لیے عربی میں لفظ''العلاقۃ'' آتا ہے، یہ وہ محبت ہوتی ہے جس کا تعلق دل سے ہوتا ہے،اس پر اعشیٰ کا شعر ہے:

عُلِّقْتُهَا عرضًا، وَعُلِّقَتْ رَجُلًا غَيْرِيْ وَعُلِّقَ أُخْرَى غَيْرَهَا الرَّجُلُ"

میرے دل میں اس کی طرف میلان ظاہر ہوا لیکن اس کا دل میرے علاوہ کسی اور شخص پر مائل ہوا، پھر اس شخص کے دل کا تعلق اس دوشیزہ کے علاوہ کسی اور دوشیزہ سے ہوا"۔پھر جب محبت کی آنچ تیز ہوتی ہے تو اسے''الکلف'' کہا جاتا ہے،اور جب جذبۂ محبت کو مہمیز کیا جاتا ہے اور وہ کسی حد پر رکنے کا نام نہیں لیتا تو اسے''العشق'' کا نام دیا جاتا ہے، اور جب کاروانِ محبت راہِ محبت کی کچھ اور منزلیں طے کرتا ہے تو وہ مقام آتا ہے جسے''الشغف'' کہتے ہیں،جس میں محبت کرنے والے کے دل کو ایک طرف سوزشِ عشق کا سامنا ہوتا ہے تو دوسری طرف اسے لذت اور تسکین بھی ملتی ہے، ع

''تڑپ اے دل! تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے''

اس مرحلے کو''شغف'' کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں محبت''شغافِ قلب'' تک پہنچتی ہے، شغاف اس جھلّی کو کہتے ہیں جس میں دل لپٹا ہوا ہے، حسنِ یوسف پر فریفتہ ہونے والی امرأۃ العزیز کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَن نَّفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا

''اور شہر میں عورتیں گفتگو کرنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہے اور اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔''

پھر جب محبت اور انگڑائی لیتی ہے تو اسے''الجویٰ'' کا نام دیا جاتا ہے، یہ وہ اندرونی محبت ہوتی ہے جس کی موجیں پرسکون رہتی ہیں، متنبی کا شعر ہے:

مالَنا كُلّنا جَوٍ يا رَسولُ أَنا أَهوى وَقَلبَكَ المَتبولُ

''اے نامہ بر! ہم دونوں کے دل سوزشِ عشق کا شکار ہیں، مجھے بھی تم سے محبت ہے اور تمھارا دل بھی بیمارِ عشق ہے۔''

پھر جب محبت کا سمندر طوفان سے آشنا ہوتا ہے اور اس کی موجیں تلاطم خیز ہوتی ہیں تو اسے''التیم'' کہا جاتا ہے، اسی بنا پر عربوں نے اپنی بعض اولاد کا نام''تیم اللہ'' رکھا تھا، اور محبت کے اس مرحلے تک پہنچے ہوئے انسان کو''رجل متیّم'' کہتے تھے۔

پھر جب محبت کا حدی خواں اپنی لے بڑھاتا ہے تو اسے عربی میں''تبل'' کہا جاتا ہے، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب عشق ومحبت انسان کو بیمار کردے، کعب بن زہیر کا شعر اسی کی ترجمانی کرتا ہے:

بانتْ سعادُ فَقَلْبِي اليومَ مَتْبولُ مُتيّمٌ إثْرَها لم يُفْدَ مَكْبولُ

سعاد رخصت ہوگئی تو میرا دل آج گرفتارِ محبت ہے اور اس کی جدائی پر اس طرح بیمار اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہے کہ جسے چھڑایا نہ جاسکا۔''

پھر فارس شوق ایڑ لگا کر محبت کے جس مرحلے تک پہنچتا ہے وہ ہے''التدلیہ'' یا''الدلہ''، یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب محبت کی وجہ سے انسان کی عقل ہی زائل ہوجائے، حارث بن حلزہ نے کہا ہے:

لَا أَرَى مَنْ عَهِدْتُ فِيهَا فَأَبْكِي الْيَوْمَ دَلْهَا وَمَا يَحِيرُ الْبُكَاء

''وہ صورتیں الٰہی کون سے دیس میں جا کر بس گئیں جن سے میرا واسطہ تھا، سو اب سرگشتگی ودرماندگی کے عالم میں رو رہا ہوں مگر رو کر بھی کچھ ملنے والا نہیں۔''

پھر جب محبت کا وہ درجہ آتا ہے جس میں محبت کے غلبے کی بنیاد پر انسان فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے اور اس کا وجود ہی مٹ جاتا ہے، تو اسے ''ھیام'' کہتے ہیں، چناں چہ احوص کہتا ہے:

أُهَيْمُ بِدَعْدٍ مَا حَيِيتُ فَإِنْ أَمُتْ فَوَا حُزْنَا مَنْ ذَا يَهِيمُ بِهَا بَعْدِي

''جب تک جان میں جان ہے، میں دعد کا دیوانہ رہوں گا اور اگر میں مرجاؤں تو پھر افسوس! کون ہے میرے بعد اس پر فریفتہ ہونے والا۔''

پھر کشتیِ محبت آخر میں پہنچ کر جس ساحل سے آشنا ہوتی ہے اور وہی اس کی آخری منزل بھی ہے وہ ہے ''ودّ''، یہ محبت کے درجات میں سب سے اعلیٰ اور ارفع درجہ ہے، یہ پاکیزہ محبت ایک انسان کا دوسروں سے رشتہ استوار کرتی ہے، یہ انتہائی اعلیٰ مقام ہے جس کی طرف وہی بڑھ سکتا ہے اور وہی پرواز کرسکتا ہے جس کے احساسات اور عقل میں بلند پروازی ہو، جس کی عبادت پاکیزہ ہو، جو راہِ راست کے مطابق اپنے رب کی بندگی اور اطاعت کرے اور پورے علم اور بصیرت کی روشنی میں اپنے رب کے احکام کی بجا آوری کرے، جسے پوری طرح اپنے رب کی معرفت حاصل ہو، حق تعالیٰ کی معرفت کے حصول کی راہ میں اس کے احساسات وجذبات کی پرواز بھی اونچی ہو اور بندگی کا مزہ بھی اس نے چکھا ہو اور جس نے یہ مزہ چکھ لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اسی کے ساتھ اس کے دل میں یہ تمنا موجزن ہو اور اس کے سر میں یہ سودا سمایا ہو کہ اس بلند اور عظیم درجے اور اعلیٰ وارفع مقام پر وہ ہمیشہ فائز رہے، اسی وجہ سے اہلِ ایمان میں سے اپنے خاص اور محبوب بندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ انھیں ''ودّ'' کا یہ مقام عطا کرے گا، ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا (مریم:96)

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبت پیدا کرے گا۔''

اور خود اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق ارشاد فرمایا کہ اس کی ذات ''ودود'' ہے (خود بھی ''ودّ'' سے بھرپور اور دوسروں کو بھی ''ودّ'' عطا کرنے والی)۔ ارشاد ہے:

وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ○ (ھود:90)

''اور اپنے پروردگار سے بخشش مانگو اور اس کے آگے توبہ کرو، بے شک میرا پروردگار رحمت اور محبت والا ہے۔''

اسی طرح فرمایا:

إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ○ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ○ (البروج)

''وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ (زندہ) کرے گا اور وہی بڑا بخشنے والا، بڑی محبت کرنے والا ہے۔''

اسی لیے ''مودّت'' وہ عظیم دولت ہے جس سے اللہ عزوجل خوش قسمت مومن جوڑے کو نوازنا چاہتا ہے، اگر میاں بیوی شریعت کے رہنما خطوط کو سامنے رکھ کر زندگی کی راہوں پر چلیں تو یہ وعدہ ہے ربّ ذوالجلال کا کہ دونوں کے دلوں میں الفت کے بیج بوئے گا اور مودت کی بنیادیں استوار فرمائے گا، اور اس نے خود بتایا ہے کہ یہ ''مودّت'' اس کی عظیم نشانیوں میں سے ایک ہے، حق تعالیٰ کا اپنی قدرت کی نشانیوں اور ربوبیت کے جلووں کے تحت اس کو شمار کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ الٰہی نعمت کیسی عظمت کی حامل ہے؟!، اور اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ''مودّت ورحمت'' کوئی آسان اور ہاتھ لگتی چیز نہیں ہے کہ سہولت کے ساتھ اس تک رسائی ہوجائے بلکہ اس کے حصول کے لیے توفیقِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی ہی رہ نما ہے۔

یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کے حصول میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو ان کا متلاشی ہو، ان کی جستجو میں سرگرم ہو اور ان تک رسائی کے لیے نیکیوں کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے اور اعمالِ صالحہ کی راہ میں تگ ودو کرے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (الروم:21)

''اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ ان کی طرف (مائل ہوکر) آرام حاصل کرو اور اس نے تمھارے بیچ پیار ومحبت اور مہربانی رکھی، اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو فکر سے کام لیتے ہیں۔''

اور مودّت ہی وہ مقام ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے آل کے حق میں اس کا خیال اور لحاظ رکھنے کا قرآن میں واسطہ دیا گیا، چناں چہ ارشاد ہے:

قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (الشوری:23)

''کہہ دو کہ میں اس کا تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا مگر (تم کو) قرابت کی محبت (کا تو خیال رکھنا چاہیے)''

دجالی فتنہ کے خدوخال اور اس سے حفاظت کا طریقہ

محمد احمد حافظ

ایمان اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے کہ جس کا کوئی بدل نہیں۔ یہ دل کے سچے یقین، زبان کے محکم اقرار اور اعمالِ صالحہ کا مجموعہ ہے۔ ایمان انسان کو دنیا و آخرت کی حقیقی کامیابی، سکونِ قلب اور جہنم سے آزادی دلا کر جنت کا حقدار بناتا ہے۔ بغیر ایمان کے اعمال صالحہ کا آخرت میں کوئی وزن اور کچھ حقیقت نہیں، حدیث شریف میں ہے:

عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت ، قلت یا رسول اللہ! ابن جدعان کان فی الجاھلیة یصل الرحم ویطعم المسکین فھل ذاک نافعة؟ قال صلی اللہ علیہ وسلم لا ینفعہ انہ لم یقل یوما رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین۔

ترجمہ: حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ابن جدعان تو زمانۂ جاہلیت میں صلہ رحمی بھر کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا وغیرہ بھی کھلاتا تھا، تو کیا یہ نیک اعمال اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اعمال اس کو نفع نہیں دیں گے؛ کیوں کہ ایک دن بھی اس نے یہ نہیں کہا کہ اے میرے پروردگار! قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف کر دینا۔

فائدہ: امام نووی رحمہ اللہ شارح مسلم فرماتے ہیں، مراد اس جملے سے (اے میرے پروردگار قیامت کے دن میری خطا کو معاف فرما دینا) یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لایا، بل کہ کفر کی حالت میں موت آئی۔ پتہ چلا ایمان کے بغیر مسئلہ آخرت حل نہیں ہوگا۔ لیکن ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ یہ گھٹتا بڑھتا اور پرانا ہوتا رہتا ہے۔ اس کی تروتازگی ماند پڑ جاتی ہے، اس کی قوت کمزور ہوجاتی ہے، اسے مسلسل تروتازہ رکھنے کے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان الایمان لیخلق فی جوف احدکم کما یخلق الثوب فسلوا اللہ تعالیٰ ان یجدد الایمان فی قلوبکم"۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تمہارے دلوں میں ایمان ایسا ہی پرانا ہوجاتا ہے؛ جیسا کہ کپڑا پرانا ہوجاتا ہے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہارے دلوں میں ایمان کو تروتازہ کر دیں۔''

اسی طرح ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: جددوا ایمانکم، قیل یا رسول الله وکیف نجدد ایماننا؟ قال واکثروا من قول لا اله الا الله۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہا کرو، کسی (صحابی) نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! ہم اپنے ایمان کی تجدید کس طرح کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لا الہ الا اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو (اس سے ایمان میں تازگی آجاتی ہے)۔

دور حاضر میں قیامت سے قبل ظاہر ہونے والے بڑے فتنوں میں سب سے ہولناک فتنہ دجال کا ہے۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس فتنے کو انسانیت کے لیے سب سے بڑا امتحان قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بارہا دجال کے فتنے سے خبردار فرمایا اور اس سے بچنے کے طریقے بھی سکھائے۔

حدیث میں ہے: **قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ما بین خلق آدم إلی قیام الساعة خلق اکبر من الدجال، وفي روایة: أمر اکبر من الدجال**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامت آنے تک کوئی امر (کوئی واقعہ اور حادثہ) دجال کے فتنہ سے بڑا اور سخت نہ ہوگا۔'' (الجامع الصحیح لمسلم، کتاب الفتن)

اتنا خوف ناک فتنہ ہونے کے باوجود حدیث میں آتا ہے کہ لوگ اور ائمہ اس کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیں گے۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا یخرج الدجال حتی یذهل الناس عن ذکره وحتی تترک الأئمة ذکره علی المنابر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجال اس وقت تک نہیں نکلے گا جب تک لوگ اس کے تذکرے سے غافل نہ ہوجائیں، یہاں تک کہ ائمہ بھی منبروں پر اس کا تذکرہ چھوڑ دیں۔ (مسند الامام احمد بن حنبل)

دجال کا ظہور ایک عظیم آزمائش ہوگی، جس میں ایمان، بصیرت اور اللہ پر کامل یقین رکھنے والے ہی ثابت قدم رہ سکیں گے۔ دجال ایک ایسا شخص ہوگا جو خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ اس کی ظاہری علامات احادیث میں واضح طور پر بیان ہوئی ہیں: دجال کی ایک آنکھ کانا ہوگی۔ اس کی پیشانی پر ''کافر'' لکھا ہوگا، جسے ہر مومن پڑھ سکے گا۔ وہ غیر معمولی قوتوں اور دھوکے سے لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ وہ بارش برسانے، زمین سے پیداوار نکالنے اور دیگر حیرت انگیز امور دکھا کر لوگوں کو فریب دے گا۔ پوری دنیا میں تیزی سے سفر کرے گا، سوائے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے،

جہاں داخل نہ ہوسکے گا۔ دجالی فتنہ کیوں خطرناک ہے؟ یہ فتنہ صرف ظاہری طاقت کا نہیں بلکہ فکری، روحانی اور اعتقادی گمراہی کا فتنہ ہوگا۔ دجال لوگوں کے ایمان کو نشانہ بنائے گا، حق و باطل کو خلط ملط کرے گا، اور دنیاوی مفادات کے ذریعے انسانوں کو اپنے جال میں پھنسائے گا۔ یہ بات احادیث کی روشنی میں بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ فتنہ دجال میں وہی لوگ مبتلا ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو اطاعت وفرماں برداری سے نکال کر معاصی اور خواہشات نفس کے سپرد کر رکھا ہوگا۔ اجتماعی طور پر اس چیز کے مظاہر اب عام نظر آتے ہیں۔ ہمارا نوجوان طبقہ؛ خصوصاً کالج یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبہ جس تیزی کے ساتھ شرعی کبائر کا شکار ہورہے ہیں، ان میں جس تیزی کے ساتھ شیطانی تہذیب کے مظاہر پنپ رہے ہیں؛ وہ غیر معمولی معاملہ ہے۔ آج کے دور میں لبرل ازم ،سیکولرازم ،ڈیماکریسی ،کیپیٹیل ازم کے غلبے، جھوٹ، فریب، مادہ پرستی، میڈیا کی گمراہ کن یلغار، اور دینی شعور کی کمزوری کو دجالی نظام کی تمہید سمجھا جاسکتا ہے۔

دجال کے فتنے سے حفاظت کے طریقے:

1. مضبوط ایمان اللہ تعالیٰ پر کامل یقین، توحید پر استقامت، اور دین کی صحیح سمجھ سب سے بڑی حفاظت ہے۔
2. سورۂ کہف کی تلاوت، احادیث کے مطابق سورۂ کہف کی ابتدائی اور آخری آیات کی تلاوت دجال کے فتنے سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔
3. دعا کا اہتمام نماز میں خصوصاً یہ دعا مانگنا: **اللهم إني أعوذ بك من فتنة المسيح الدجال.**
4. دینی علم حاصل کرنا جہالت انسان کو آسانی سے گمراہ کرتی ہے، اس لیے قرآن وسنت کا علم ضروری ہے۔
5. صالح صحبت، نیک لوگوں کی صحبت ایمان کو مضبوط کرتی ہے۔
6. مکہ ومدینہ کی فضیلت، حادیث میں آیا ہے کہ دجال ان مقدس شہروں میں داخل نہیں ہوسکے گا۔

موجودہ دور میں ہماری ذمہ داری:

اپنے ایمان کی حفاظت، اولاد کی دینی تربیت، جھوٹے نظریات اور فتنوں سے آگاہی، قرآن وسنت سے وابستگی، دعا اور استغفار کا اہتمام کرنا۔ دجال کا فتنہ محض ایک آنے والا واقعہ نہیں بلکہ ہر دور کے باطل، فریب اور گمراہی کے خلاف ایک تنبیہ بھی ہے۔ مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان، علم، اور عمل کو مضبوط کرے، اللہ کی پناہ طلب کرے، اور ہر قسم کے ظاہری و باطنی فتنوں سے ہوشیار رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دجال کے فتنے اور ہر گمراہی سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

شرحِ احادیث میں فکری منہج کی ضرورت ومعنویت

تکملہ فتح الملہم کی ایک نئی جہت کا مطالعہ

عبدالوہاب سلطان دِیروی

برصغیر میں احادیث کی تشریح وتوضیح کی روایت کا ایک نمایاں وصف یہ تھا کہ اس میں ''فقہی تشریح'' کو مرکزیت حاصل رہی۔ احادیث کی توضیح زیادہ تر اس زاویے سے کی جاتی تھی کہ ان سے فقہِ حنفی کے اصول وفروع کی تائید اور استنباط کس طرح ہوتا ہے؟۔ یہ اپنے زمانے کی ایک حقیقی ضرورت تھی۔ جب فقہِ حنفی کو حدیث سے الگ، بلکہ کبھی اس کے بالمقابل ایک مستقل مکتب کے طور پر پیش کرنے کی ناروا کوششیں ہوئیں، تو یہ ناگزیر تھا کہ خود احادیث کی روشنی میں یہ حقیقت واضح کی جائے کہ حنفیت دراصل حدیث ہی کے فہم اور اس پر عمل کی ایک منظم فقہی تعبیر ہے۔

یہ ضرورت جس شان سے پوری ہوئی، اس کا روشن ترین مظہر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی تاریخ ساز کتاب ''اِعلاء السنن'' ہے۔ اس کتاب نے یہ دِکھا دیا کہ فقہِ حنفی اور حدیث کے درمیان جو نسبت ہے، وہ استدلال اور تحقیق کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ یوں ایک بڑا علمی خلا بڑی حد تک پُر ہو گیا۔

عصرِ حاضر کے انسان کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ کسی حدیث سے کون سا فقہی حکم ثابت ہوتا ہے، اس کا سوال یہ بھی ہے کہ اس حکم کے پس پردہ کون سی حکمت کارفرما ہے؟، وہ شریعت کے کس مقصد کی تعبیر ہے؟، اور جدید تہذیب کے پیچیدہ مسائل میں اس کی رہنمائی کیا ہے؟۔ یہاں شرحِ حدیث کو ایک نئی زبان اور ایک نئے منہج کی ضرورت تھی، ایسی زبان جو حدیث کے الفاظ سے آگے بڑھ کر اس کی فکر تک رسائی حاصل کرے۔

تکملہ فتح الملہم کا شاید سب سے نمایاں امتیاز یہی ہے کہ اس نے شرحِ حدیث میں اس نئی جہت کا اضافہ کیا۔

حضرت استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم نے صرف یہ نہیں بتایا کہ ایک حدیث سے کون سا فقہی حکم نکلتا ہے، بلکہ بحیثیت مجموعی یہ بھی واضح کیا کہ وہ حکم شریعت کے کس مزاج کی نمائندگی کرتا ہے؟!، اس کے پیچھے کون سا مقصد کارفرما ہے، اور جدید فکری اعتراضات کے مقابلے میں اس کی معنویت کیا ہے؟!۔ یوں فقہی تشریح کے ساتھ ایک ''فکری تشریح'' بھی سامنے آئی، جو حدیث کو محض ایک جزئی حکم کے بجائے ایک ہمہ گیر فکری نظام کا حصہ بنا کر پیش کرتی ہے۔

یہاں مصنف علام محض بطورِ فقیہ یا محدث جلوہ گر نہیں ہوتے، بلکہ بطورِ ’مفکر‘ مفکر جزئی تفصیلات کے گلہائے رنگا رنگ سے بھی کلی اصولوں کا رَس کشید کرتے ہیں۔ مفکر کا معنی بھی یہ ہے کہ جو جزئیات کی بھول بھلیوں سے جست لگا کر کلیات تک رسائی کا فن جانتا ہو۔ جو خیال آفرینی کی بھٹی میں سنگریزے کو سونا بنانے کا ہنر جانتا ہو۔

جزئیات یا جزئی مسائل ایک مفتی یا اختصاصی محقق کا میدانِ کار ہوتا ہے۔ ’مفتی‘ جزئیات اور ان جزئیات کی تفصیلات کو برتتا اور موضوعِ سخن بناتا ہے۔

ایک مفتی نماز کے مسائل کو زیرِ بحث لاتا ہے تو اس کے ارکان وشرائط کے ایک ایک جزئیہ کو قرآن وسنت، اجماع وقیاس کی کسوٹی پر پرکھتا یا نقل کرتا ہے۔ مفکر مگر یہی موضوع لیکر اس کے حدودِ اربعہ کو وسعت دیتا ہوا اس کو ایک مربوط فلسفہ یا نظام بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ یوں اس موضوع پر اس کی گفتگو فلسفہ صلاۃ یا نظامِ صلاۃ بن کر نمودار ہوتی ہے۔

مثال سے بات نکھرتی ہے۔ صلاۃ، صیام، روزہ پر کسی فتویٰ کی کتاب یا مفتی کا خطاب دیکھ لیجئے، کفایت المفتی، احسن الفتاویٰ یا جو بھی، پھر اسی موضوع پر حکیم الاسلام قاری طیب صاحب کا کوئی خطاب یا تحریر پڑھ لیجئے، حضرت قاری صاحب بادی النظر میں چھوٹی نظر آنے والی بات کو کھولتے کھولتے فلسفہ نظام زکاۃ اور اسلام کا نظام زکاۃ جیسے موضوعات کا قالب دے دیتے ہیں۔ خطبات حکیم الاسلام کے ہر دوسرے تیسرے خطاب میں یہ رنگ وآہنگ دیکھا جاسکتا ہے۔

ارکانِ اربعہ پر مفکر اسلام مولانا ابوالحسن ندوی کی ’’الارکان الاربعہ‘‘ بھی اس کی دلچسپ مثال ہے۔ یہاں آپ کو نماز کے شرائط وارکان نہیں ملیں گے، بلکہ اس کی مصالح اور حکمتوں کی گتھیاں سلجھتی ہوئی ملیں گی۔ علامہ ندوی نے بطورِ مفکر ہر ہر رکن کے فلسفہ تشریع وتعبّد کو فکری کینوس پر رکھ کر اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ دل ودماغ کی فضائیں ایمان کی بادِ بہاری سے آباد ہوجاتی ہیں۔ نماز، روزہ زکاۃ اور حج کو دیگر ادیان کے تقابل کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو الگ ہی الگ ہی سماں باندھ دیتے ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسن ندوی بایں معنی اگر ’’مفکر اسلام‘‘ کہلائے گئے تو بجا کہلائے گئے۔ وہ اَقوامِ عالم کی تہذیب وتمدن کے مزاج شناس تھے، اور انسانی تاریخ کے محرم راز بھی، آپ کی ہر ہر کتاب آپ کے فکری جولانیوں کا زندہ و جاوید مرقع ہے۔ آپ جب بطور مفکر خونِ دل کی سیاہی میں قلم ڈبو کر اپنے افکار زیبِ قرطاس کرتے ہیں تو قرطاس کے پَر جلتے محسوس ہوتے ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ نے ’’اسلام کا نظامِ دعوت‘‘ میں بھی اسی فکری شان کے

جلوے بکھیرے ہیں، جبکہ اس اس موضوع پر حضرت مولانا عبدالشکور ترمذی صاحب کا رسالہ ''تبلیغ کی شرعی حیثیت'' آپ کے افتائی ذوق کا مظہر ہے۔

موضوعاتی دائرہ کار کی ترجیحات بھی دونوں کی الگ ہوتی ہیں۔ مفکر کی جولان گاہ ملی اور سماجی مسائل ہوتے ہیں۔ ٹھیٹھ شرعی مسائل کو بھی ملی اور سماجی زاویے سے دیکھ کر اپنا نتیجہ فکر وں ظر پیش کرتا ہے۔

مفکرین احکام کی فکری بنیادوں، تہذیبی قدروں کو جلوہ آراء کرتے ہیں۔ ان احکام کی مقاصدی اور سماجی معنویت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مختلف جزئی احکام کو ایک لڑی میں پرو کر کارگاہِ حیات کے کسی بھی شعبہ کا پورا نظام تشکیل دیتے ہیں۔

مفکر کے مآخذِ فکر بھی وہی ہوتے ہیں جو ایک مفتی یا فقیہ کے مدارکِ فقہ ہوتے ہیں، دونوں شریعت کے چشمہ سے ہی سیراب ہوتے ہیں، وہ (مفکر) مگر ترجیحی بنیادوں پر سیرتِ طیبہ کے جزئی واقعات اور مقاصدِ شریعت کے وسیع تر آفاق سے خوشہ چینی کرتے ہیں، کہ یہی علوم وفنون کلّی افکار وآراء کو علمی کمک پہنچاتے ہیں۔

ایک اور زاویے سے دیکھئے۔ شریعت نے مثلاً معیشت کا ''بطورِ نظام'' یا سسٹم کے کوئی مربوط خاکہ نہیں دیا۔ جامع آفاقی احکام البتہ دیئے ہیں۔ یہی لچک شریعت کا حسن بھی ہے، جو اس کو ہر زمان ومکان کے تقاضوں کو ایڈریس کرنے کی صلاحیت بخشتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بطور ''مفکر'' یہاں ان جزئی احکام ومسائل کو جدید معاشی نظاموں کے تناظر میں پڑھ کر مربوط کرتے ہیں، اور ''اسلام کے معاشی نظام'' کے طور پر اس کو آشکارا کرتے ہیں، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کے مقابلے میں اس کی خصوصیات کو عصر حاضر کے معاشی کینوس پر رکھ کر پیش کرتے ہیں تو یہاں آپ ایک مفکر ہوتے ہیں، آگے جب ہر ہر مسئلہ کی فقہی تکییف وتفصیل کرتے ہیں تب بحیثیت فقیہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ولیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

انسانی ذہن خودکار طریقے سے ایک کردار سے دوسرے کردار میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

علامہ اقبال اور مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اسلامی ریاست کے اصول ومبادی کا خاکہ پیش کیا تھا، تب ہی مفکر پاکستان کہلائے، علامہ اقبال تو خود کو شاعر غزل خواں ماننے کے روادار نہیں تھے! ع

''مرا یاراں غزل خوانے شمردند''

وہ اپنی راز حیات آہ وفغاں کو گردانتے ہوئے کہتے ہیں:

ہر کسے ازظنِ خود شدیارِمن
وزدرون من نہ جُستبت اسرار من
سر من ازنالہ من دور نیست
لیک چشم و گوش راآں نورنیست

''ہرشخص اپنے خیال کے مطابق میرا یار بننے کا گمان پالتا ہے لیکن کوئی میری ذات میں جھانک کر میرے سربستہ راز کو نہ جان سکا، حالانکہ میرا راز میری آہ وفغاں سے دور نہ تھا لیکن اس کا کیا کیجئے کہ کسی کی آنکھ اور کان میں وہ نور ہی جھلکتا جو مجھے میرے فکر ونظر کو دیکھ یا سننے کی صلاحیت رکھے۔''

بہرحال، اس منہج کی فکری جڑیں بلاشبہ ان عظیم کتابوں میں پیوست ہیں جنہوں نے اسلام کو اس کے کلی نظام کے طور پر سمجھنے کی دعوت دی، جیسے امام ابن القیم کی ''اعلام الموقعین''، امام شاطبی کی ''الموافقات'' اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''حجۃ اللہ البالغۃ''، تاہم ''تکملہ فتح الملہم'' میں یہ روایت پہلی مرتبہ شرحِ حدیث کے متن میں اس تسلسل اور اہتمام کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، اوور عصر حاضر کے جدید افکار اور شبہات کو بھی علمی بنیادوں پر ایڈریس کرتی ہے اور ان کتب کے حوالہ جات بھی اسی لیے یہاں اس عظیم کتاب کے علمی مقدمات کے ذیل میں بکھرے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ کتاب الرضاع، کتاب البیوع، کتاب الرق، کتاب القضاء، کتاب الفرائض اور متعدد دیگر ابواب کے آغاز میں ایسے تمہیدی مباحث ملتے ہیں جو شریعت کی فکری روح کا تعارف پیش کرتے ہیں۔ ان مباحث میں مقاصدِ شریعت، اسلام کا عمومی مزاج، انسانی معاشرے کی تشکیل، جدید شبہات کا جائزہ، اور ان کے علمی جوابات اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ قاری حدیث کو صرف ایک جزئی حکم کے طور پر نہیں، بلکہ ایک زندہ فکری نظام کے ساتھ مربوط کر کے پڑھنے لگتا ہے۔

شاید اسی کو شرحِ حدیث کا اگلا ارتقائی مرحلہ کہا جاسکتا ہے، جس کی طرح حضرت استاذ محترم نے اس عظیم الشان تصنیف میں ڈالی ہے، انہی جیسی خصوصیات کی بناء پر علامہ عصر شیخ قرضاوی نے اس کو ''شرح العصر'' قرار دیا ہے۔

''تکملہ فتح الملہم'' کے منہج پر مختلف زبانوں میں متعدد علمی مقالات لکھے جاچکے ہیں، جو بحمد اللہ چار دانگ عالم میں اس کتاب کی مقبولیت ومرجعیت کا ثبوت ہیں، مگر اس کے اس ''فکری منہج'' پر ابھی تک مستقل تحقیق سامنے نہیں آئی ہے۔ حالانکہ یہ پہلو خود ایک مستقل موضوع ہے، اور اس پر سنجیدہ مطالعہ مستقبل میں شرحِ حدیث کی نئی راہیں متعین کرسکتا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر:۹)

حضرت شیخ شمس الدین محمد بن احمد رملی رحمۃ اللہ علیہ

(۹۱۷-۱۰۰۴ھ/ ۱۵۱۳-۱۵۹۶ء)

مولانا جنید اشفاق اٹکی

برصغیر پاک و ہند میں تقریباً ہر حدیث کی سند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے واسطے سے ہوتی ہوئی نبی کریم ﷺ تک پہنچتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے علمِ حدیث حجاز سے برصغیر منتقل کیا تھا۔ یہ اسناد مختلف مشائخ سے ہوتی ہوئی نبی کریم ﷺ تک پہنچتی ہیں، ان اسناد میں آنے والی ہر ہر شخصیت علوم ومعارف کی درخشاں تاریخ ہے۔ سیدی وسندی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بندہ کو حکم فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی سند میں آنے والے مشائخ کے کچھ احوال جمع کروں تاکہ اندازہ ہو کہ یہ شخصیات علوم ومعارف کی کن بلندیوں پر فائز تھیں۔ الحمدللہ **اس سلسلے کا پانچواں مضمون پیشِ خدمت ہے(۱)۔ یہ مضمون حضرت شاہ صاحبؒ کی صحیح بخاری کی سندِ حدیث میں آنے والی پانچویں شخصیت حضرت شیخ محمد بن احمد رملیؒ کے بارے میں ہے۔ (جنید)**

قدرِ زر، زرگر شناسد قدرِ جوہر جوہری:

فطرت مقتداؤں کی پرورش خود کرتی ہے، غیر معمولی معرکے سَر کرنے والے قدرت کی آغوش میں پھلتے پھولتے ہیں، ان کی نشونما دوسروں سے الگ تھلگ ہوتی ہے ، دیکھنے والوں کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ بچہ عام بچوں کی طرح نہیں ہے، سیدنا حسن بصریؒ کی والدہ خیرۃ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کیا کرتی تھیں، بسا اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں تو حسن رونا شروع کر دیتے، ام المؤمنین اٹھا کر سینے سے لگاتیں اور دودھ پلاتیں (۲)۔ یہاں بھی قدرت متوجہ تھی، اس بچے نے بعد والوں کے لیے مثال بننا تھا، پھر دنیا نے دیکھا کہ ام المومنین کے سامنے رونے والا یہی بچہ ساری زندگی اللہ کی محبت میں رویا اور ایسا رویا کہ خوف وحزن کا مستقل سلسلہ وجود میں آ گیا اور لاکھوں رونے والے اس سلسلے سے منسوب ہوئے۔ اس طرح کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو اسلامی تاریخ کا درخشاں پہلو ہے۔

شہاب الدین احمد بن حمزہ رملیؒ (المتوفی ۹۵۷ھ) کے صاحبزادے، شافعیِ صغیر، مفتی اعظم مصر،

---

(۱)۔ اس سے پہلے کے چار مضامین ماہنامہ البلاغ کے مختلف شماروں میں چھپ چکے ہیں۔

(۲) تہذیب الکمال ج: ۶ ص ۹۷

شمس الدین محمد بن احمد رملیؒ (المتوفی ۱۰۰۴ھ) بھی انہی اولیاء کرام میں سے ہیں، جن کی ولایت کی علامات بچپن ہی میں ظاہر ہورہی تھیں۔

آپ کے بارے میں شیخ عبدالوہاب بن احمد شعرانیؒ (۹۷۳ھ) کی ذیل کی غیر معمولی گواہی ملاحظہ فرمائیں:

''میری آپ کی رفاقت، جب آپ میرے کندھے پر سواری کیا کرتے تھے، اس وقت سے لے کر آج ۹۶۱ھ تک کی ہے، میں نے آج تک کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی، جو آپ کے دین کو داغدار کرے، آپ بچپن میں کبھی بچوں کے ساتھ کھیل کود میں نہیں پڑے، بلکہ تقوی، دین داری، اعضاء و جوارح کی حفاظت اور عزت آبرو کی صفائی کے ساتھ پروان چڑھے، آپ کے والد نے آپ کی تربیت کی اور اللہ تعالیٰ کی انتہائی توفیق سے بہترین تربیت کی۔ میں آپ کے والد کے پاس مدرسہ ناصریہ میں پڑھا کرتا تھا، جب میں آپ کو اپنے کندھے پر بٹھاتا تھا تو آپ پر صلاح و توفیق کے آثار دیکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں ہماری امیدوں کو پورا کیا، محبت کرنے والوں کی آنکھیں آپ سے ٹھنڈی ہوئیں، اور آج آپ مصر والوں کے لیے فتاوی تحریر کرنے میں مرجع ہیں(۱)۔''

ولادت ونسب:

آپ کی ولادت جمادی الاولی ۹۱۹ھ میں مصر میں ہوئی(۲)۔ تاریخِ پیدائش میں اکثر کتب میں یہی قول منقول ہے، تاہم قرینِ قیاس، نجم الدین الغزیؒ کا قول ہے۔

نجم الدین محمد بن محمد الغزی دمشقیؒ (۱۰۶۱ھ) آپ سے استفادہ کرنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب ''لطف السمر و قطف الثمر'' میں والہانہ انداز میں آپ کا ذکرِ خیر فرماتے ہیں۔ آپ کی تاریخ پیدائش کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

مولده كما قرأته بخطه في إجازته للشيخ عمر بن الكاسوحة: سلخ جمادى الأولى سنة سبع عشرة- بتقديم السين في الأولى- وتسعمائة(۳)

'' آپ کی طرف سے اجازتِ حدیث جو آپ نے شیخ عمر بن کاسوحہ کو عطا کی تھی، اس میں، میں

---

(۱) لطف السمر و قطف الثمر ج: ۱ ص: ۷۹ الرقم: ۲۲

(۲) خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر ج: ۳ ص: ۳۴۷

(۳) لطف السمر و قطف الثمر ج: ۱ ص: ۷۸ الرقم: ۲۲

نے آپ ہی کے ہاتھ سے تحریر شدہ، آپ کی تاریخ پیدائش، اَخیر جمادی الاولی ۹۱۷ھ پڑھی تھی۔''

یہاں آپ اہتمام کے ساتھ **بتقدیم السین فی الاولی** کے الفاظ بھی نقل فرمارہے ہیں تاکہ **تسع عشرة** (۱۹) اور **سبع عشرة** (۱۷) کا فرق واضح ہوجائے۔ آپ کے شاگرد کی طرف سے انتہائی جزم کے ساتھ یہ بات کہنا اس قول کی صحت کی طرف مشیر ہے۔

آپ کا مکمل نام شمس الدین محمد بن احمد بن حمزہ رملی منوفی انصاری ہے۔ رملہ مصر کے صوبہ منوفیہ کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔ ان دونسبتوں کی وجہ سے آپ کو رملی اور منوفی کہا جاتا ہے۔ تاج العروس کے مصنف رملہ کی تحقیق فرماتے ہوئے لکھتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ رملہ پانچ جگہوں کا نام ہے، جن میں سے ایک جگہ مصر میں واقع ہے، شمس الدین محمد بن احمد بن حمزہ رملی شافعی اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو شام کے رملہ کی طرف منسوب کرنا غلط ہے(۱)۔

تربیت کو حسنِ صحبت چاہیے:

شیخ محمد بن احمد رملیؒ اپنے والد کی آغوش میں پلے بڑھے تھے، آپ کی تعلیم وتربیت میں آپ کے والد کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ آپ کے والد کا نام شہاب الدین احمد بن حمزہ رملیؒ ہے، بعض کتب میں یہ نام احمد بن احمد بن حمزہ رملیؒ مذکور ہے، تاہم آپ اپنے لقب شہاب الدین سے معروف ہیں۔

شہاب الدین احمد بن حمزہ رملیؒ اپنے وقت کے جلیل القدر علماء میں سے تھے۔ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے اپنی کتاب **الطبقات الوسطی** میں آپ کا ذکرِ خیر انتہائی عقیدت کے ساتھ فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں:

> علومِ شرعیہ میں آپ انتہائی بلند درجے کے حامل تھے، سوائے چند ایک کے، پورے مصر کے شافعی علماء آپ کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، چنانچہ موجودہ دور میں ہر شافعی عالم آپ کا شاگرد یا آپ کے شاگردوں کا شاگرد ہے... ...
>
> آپ اپنے کام خود کیا کرتے تھے، کسی کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ کے لیے ضرورت کی کوئی چیز بازار سے خریدے، یہاں تک کہ آپ بوڑھے اور عاجز ہوگئے۔
>
> مصر کے تمام اولیاء کرام یہاں تک کہ مجاذیب بھی آپ کی عزت واحترام فرمایا کرتے تھے۔ خصوصاً شیخ نورالدین مرصفیؒ اور شیخ علی خواصؒ... ...

---

(۱) ملخص من تاج العروس (رمل)

(شیخ عبدالوہابؒ فرماتے ہیں) میرے ساتھ ان کی محبت انتہائی شدید تھی، جس طرح کوئی آقا اپنے غلام سے محبت کرتا ہے۔ ایک دفعہ میں ایسا بیمار ہوا کہ موت نظر آنے لگی، اور میں نے وصیت کر دی۔ شیخ شہاب الدین رملیؒ اور ان کے بیٹے سیدی محمد (شمس الدین رملیؒ) میری عیادت کے لیے تشریف لائے، شیخ دعا فرما رہے تھے اور ان کے صاحبزادے محمد، آمین کہہ رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ عزم وہمت کی انتہائی پختگی کے باعث، شیخ کی دعا بجلیوں کی مانند آسمان کی طرف چڑھتی جا رہی تھی۔ آپ مجھ سے اس حال میں جدا ہوئے کہ مجھے اس بیماری سے شفا مل گئی (۱)۔"

شہاب الدین رملیؒ کی تصانیف درج ذیل ہیں:

شرح الزبد لابن ارسلان، شرح منظومة البيضاوی فی النكاح، رسالة فی شروط الامامة، شرح شروط الوضوء (۲)، آپ کے فتاوی (جو آپ کے صاحبزادے شمس الدین محمد بن احمد رملیؒ نے جمع فرمائے ہیں)۔ (۳)

شمس الدین رملیؒ، اپنے جلیل القدر والد شہاب الدین رملیؒ کی صحبت میں ترقی کے مدارج طے فرماتے رہے، آپ نے اپنے والد کے پاس ہی فقہ، تفسیر، نحو، صرف، معانی، بیان اور تاریخ کی تعلیم حاصل کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی اور کی طرف جانے سے مستغنی ہو گئے، آپ نے قرآن کریم، بهجة اور دوسری مختصرات حفظ کیں، بعض حضرات آپ کے والد کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ الحمدللہ میں نے محمد کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے ہم عصر علماء میں کسی کی طرف، کم ہی محتاج ہوں گے۔ آپ نے شیخ الاسلام قاضی زکریا انصاریؒ، برہان الدین بن ابی شریفؒ اور دیگر حضرات سے بھی استفادہ فرمایا۔ آپ عجیب فہم اور قوی حافظے کے مالک تھے۔ (۴)

شیخ الاسلام قاضی زکریا انصاریؒ سے شمس الدین رملیؒ کا تعلق:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجاز سے علمِ حدیث حاصل کیا اور برصغیر پاک وہند میں اس فیض کو عام فرمایا۔ آپ نے علم حدیث شیخ ابوطاہر کردی مدنیؒ سے، انہوں نے اپنے والد شیخ ابراہیم بن حسن کردیؒ سے، انہوں

---

(۱) الطبقات الوسطی ج: ۲ ص: ۱۶۱ الرقم: ۵۳۸

(۲) معجم المؤلفین ج: ۱ ص: ۱۴۷

(۳) الأعلام ج: ۱ ص: ۱۲۰

(۴) المجددون فی الإسلام ص: ۲۸۳

نے شیخ احمد قشاشیؒ سے اور انہوں نے شیخ احمد شناویؒ سے حاصل کیا تھا۔ شیخ احمد شناویؒ نے علم حدیث، شمس الدین رملیؒ سے، اور انہوں نے قاضی زکریا انصاریؒ سے حاصل کیا تھا۔

قاضی زکریا انصاریؒ مصر کے بڑے علماء، اولیاء میں سے تھے۔ شمس الدین رملیؒ کے والد شہاب الدین رملیؒ آپ کے براہ راست اور خصوصی تلامذہ میں شامل ہیں۔ آپ کی خصوصیات میں سے ہے کہ شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ نے آپ (شہاب الدین رملیؒ) کو اجازت عطا فرمائی تھی کہ آپ ان کی کتب میں ان کی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی، درستگی کر سکتے ہیں۔ آپ کے علاوہ کسی اور کو یہ اجازت نہیں ملی۔ (۱)

شمس الدین رملیؒ کا، قاضی زکریا انصاریؒ کے ساتھ تعلق، اپنے والد شھاب الدین رملیؒ کی برکت سے بچپن ہی میں قائم ہوا، آپ نے قاضی زکریا انصاریؒ سے بچپن ہی میں وہ برکات حاصل کیں، جن کی برکت سے تا قیامت آپ سلسلۃ الذھب کا حصہ بن گئے۔ ممکن ہے کہ اپنے والد کے خصوصی تعلق کی وجہ سے تبرکاً قاضی زکریا انصاریؒ سے تلمذ کا رشتہ بھی قائم ہو گیا ہو۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ زکریاؒ کو دیکھا، وہ قد وقامت میں بالکل "الف" کی طرح سیدھے تھے، اور شیخ برھان الدین کو دیکھا تو انتہائی بڑھاپے کی وجہ سے وہ بیٹھے ہوئے سجدے جیسی حالت میں تھے، میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ شیخ زکریا باوجود زیادہ عمر ہونے کے، شیخ برھان الدین سے صحت اور جسم کے لحاظ سے بہتر ہیں تو میرے والد نے مجھے اس بات کا جواب دیا۔ (۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ زکریاؒ سے ملاقات کے وقت آپ اچھے خاصے سمجھدار ہو چکے تھے۔ قاضی زکریا انصاریؒ کی وفات ۹۲۶ھ میں ہوئی۔ شمس الدین محمد رملیؒ کی تاریخ پیدائش مشہور قول کے مطابق ۹۱۹ھ اور نجم الدین غزیؒ کے ذکر کردہ قول کے مطابق ۹۱۷ھ میں ہوئی۔ اس حساب سے قاضی زکریا انصاریؒ کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۷ سال یا ۹ سال بنتی ہے۔ شمس الدین رملیؒ کو اپنے والد ماجد شھاب الدین رملیؒ کے واسطے سے قاضی زکریا انصاریؒ کی تمام مرویات کی اجازت حاصل تھی تاہم شمس الدین رملیؒ نے اپنے والد کے واسطے کے بغیر، براہ راست بھی قاضی زکریا انصاریؒ کی روایات کی اجازتِ عامہ حاصل کی تھی۔ اس کی تائید آپ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک تحریر سے ہوتی ہے، جسے آپ کے شاگرد نجم الدین غزیؒ ذکر فرماتے ہیں۔

---

(۱) الطبقات الوسطی ج: ۲ ص: ۱۶۱ الرقم: ۵۳۸

(۲) خلاصة الأثر فی أعیان القرن الحادی عشر ج: ۳ ص: ۳۴۳

نجم الدین محمد بن محمد الغزی دمشقیؒ (۱۰۶۱ھ) کا نام، شمس الدین رملیؒ کے شاگردوں کی فہرست میں آتا ہے، آپ کا ذکرِ خیر شیخنا بالمکاتبة والاجازة کے الفاظ کے ساتھ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

و قرأت بخطه: أن له رواية عن شيخ الإسلام القاضي زكريا بالإجازة العامة (۱)

''میں نے آپ کے ہاتھ سے لکھا ہوا پڑھا کہ آپ کو قاضی زکریا انصاریؒ سے روایت کی اجازتِ عامہ حاصل تھی۔''

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے جس بچے کے بارے میں فرمایا تھا کہ جب وہ میرے کندھے پر سواری کیا کرتے تھے، اس وقت بھی مجھے ان پر صلاح وتقوی کے آثار نظر آتے تھے، یہ راز قاضی زکریا انصاریؒ پر بھی کھل چکا تھا جس کے باعث بچپن ہی میں وہ انہیں تمام مرویات کی اجازتِ عامہ عطا فرما گئے تھے۔

شاید جانبین کا اخلاص تھا کہ یہی سند اتنی مشہور ہوئی کہ آج برصغیر پاک و ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے واسطے سے بخاری شریف کی جو سند ملتی ہے، اس میں شمس الدین رملیؒ کے بعد متصل، بغیر کسی واسطے کے قاضی زکریا انصاریؒ کا نام آتا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بچوں کو اجازت دینے کے سلسلے میں مشائخ کا ذوق مختلف رہا ہے، اور اس کی اصل اس مختلف فیہ بات پر قائم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بچوں کی لی گئی روایات معتبر مانی گئی ہیں یا نہیں؟ نیز تحمل حدیث کے لیے کم سے کم عمر کتنی مانی جاتی ہے، چونکہ اس اصل میں مشائخ کے مختلف اقوال ہیں، اسی بنا پر بچوں کو حدیث کی اجازت دینے کے سلسلے میں بھی مشائخ کا ذوق مختلف رہا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت شمس الدین رملیؒ کی اس سند پر اشکال نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ آپ کو قاضی زکریا انصاریؒ کی مرویات کی اجازت اپنے والد سے بھی حاصل تھی، اگر بچہ ہونے کی بنا پر سند پر کلام بھی کیا جائے تو انقطاع لازم نہیں آتا، صرف آپ کے والد شھاب الدین رملیؒ کا واسطہ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ بات قابلِ اشکال نہیں رہتی۔

شمس الدین رملیؒ کو قاضی زکریا انصاریؒ کے علاوہ شیخ الاسلام احمد بن نجار حنبلیؒ، شیخ الاسلام یحی دمیری مالکیؒ، شیخ الاسلام طرابلسی حنفیؒ، شیخ سعد الدین ذھبی شافعیؒ اور دیگر حضرات سے بھی حدیث کی اجازت حاصل تھی۔ (۲)

اصلاً آپ کا میدان فقہ تھا اور آپ اپنی فقہی خدمات ہی کی بدولت جانے جاتے تھے، تاہم حدیث کے

---

(۱) لطف السمر و قطف الثمر ج: ۱ ص: ۷۸ الرقم: ۲۲

(۲) لطف السمر و قطف الثمر ج: ۱ ص: ۷۸ الرقم: ۲۲

باب میں بھی آپ ایسے مستفید ہوئے کہ رہتی دنیا تک آپ کا نام حدیث پڑھنے پڑھانے والوں کے سامنے آتا رہے گا۔

شمس الدین رملیؒ کی بخاری شریف کی سند تبرکاً پیشِ خدمت ہے:

الشيخ شمس الدين محمد بن أحمد الرملي، عن شيخ الإسلام أبي يحيى أحمد زكريا بن محمد الأنصاري، قال: قرأت على الشيخ شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر الكناني العسقلاني صاحب فتح الباري ، عن الشيخ زين الدين ابراهيم بن احمد التنوخي ، عن ابى العباس احمد بن ابى طالب الحجار ، عن الشيخ سراج الدين الحسين بن المبارک الحنبلي الزبيدي ، عن الشيخ ابي الوقت عبد الأول بن عيسى بن شعيب السجزي الهروي ، عن الشيخ أبي الحسن عبد الرحمن بن محمد بن المظفر بن داود الداودي ، عن أبي محمد عبدالله بن أحمد السرخسي، عن أبي عبد محمد بن يوسف بن مطر بن صالح بن بشر الفربري ، وهو من أرشد تلامذة الإمام البخاري عن مؤلفه أمير المؤمنين في الحديث أبي عبدالله محمد بن اسماعيل بن ابراهيم بن بردزبة الجعفي البخاري رحمهم الله تعالى و نفعنا بعلومهم، آمين (۱)

مقام ومرتبہ:

حضرت شمس الدین رملیؒ کو دسویں صدی کا مجدد مانا جاتا ہے۔ آپ نے فقہ شافعی کی خوب خوب خدمت کی تھی، یہاں تک کہ شافعی صغیر کے لقب سے معروف ہوئے۔ المجددون فی الإسلام کے مصنف عبد المتعال الصعیدی آپ کے حالات کے تحت لکھتے ہیں:

''اپنے والد کے بعد آپ نے مسندِ تدریس کو سنبھالا، تفسیر، حدیث، اصول، فروع، نحو، معانی اور بیان کی تدریس شروع فرمائی اور علومِ نقلیہ وعقلیہ میں خوب کمال حاصل کیا۔ آپ کے درس میں آپ کے والد کے تلامذہ بھی شریک ہوتے تھے۔ ناصر الدین طبلاوی آپ کے درس میں آتے تھے حالانکہ آپ ان کے بچوں کے قائم مقام تھے۔ انہیں اس بات پر ملامت بھی کی گئی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ شمس الدین رملیؒ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ سوائے اس کے کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں ان سے اس چیز میں استفادہ کرتا ہوں، جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

---

(۱)" ثبت العثمانی" سے ماخوذ

شیخ رملیؒ کے پاس اطرافِ عالم سے طلباء آتے تھے، یہاں تک کہ دنیا میں آپ کے نام کا ڈنکا بجنے لگا اور آپ کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ آپ معاصرین میں شافعیِ صغیر کے لقب کے مستحق ہوئے، جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ اہلِ مصر وغیرہ کے لیے فتاوی فقہیہ تحریر کرنے میں مرجع تھے۔ آپ مصر میں شافعیہ کے منصبِ افتاء پر فائز ہوئے۔''(۱)

آپ کو اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، طائفہِ صوفیاء پر مکمل اعتماد و بھروسہ رہا، تاہم آپ کی شہرت فقہ اور علومِ شرعیہ کے باعث ہوئی۔(۲)

هدية العارفين کے مصنف آپ کی درج ذیل تصنیفات ذکر فرماتے ہیں:

حَاشِيَة على شرح التَّحْرِير لشيخ الاسلام، حَاشِيَة على الْعباب، شرح البهجة الوردية مُخْتَصر الحاوى الصَّغِير، شرح الْعُقُود فِي النَّحْو، شرح مُقَدّمَة الاجرومية، عُمْدَة الرابح فِي معرفَة الطَّرِيق الْوَاضِح شرح هِدَايَة الناصح للزاهد، غَايَة الْبَيَان فِي شرح زبد ابْن رسْلَان، غَايَة المرام فِي شرح شُرُوط الْمَأْمُوم والإمام لوالده، الْغرَر البهية فِي شرح مَنَاسِك النووية، فتح الْجواد بشرح منظومة ابْن الْعِمَاد، فتح الْملك المعبود لشرح العنقود، نِهَايَة الْمُحْتَاج إِلَى شرح الْمِنْهَاج للنووي۔(۳)

مصر میں آپ سے کثیر شوافع علماء نے علم حاصل کیا اور آپ کی طرف رجوع کیا۔ آپ کے اجل تلامذہ میں شیخ نورالدین زیادیؒ شامل ہیں، اس کے علاوہ شیخ سالم شبشیریؒ، شمس الدین میدانیؒ، شیخ نعمان حبر اصی اور شیخ عمر بن کاسوحہؒ بھی آپ کے تلامذہ میں شامل ہیں۔(۴)

شیخ عبدالقادر بن محمد بن احمد (المتوفی ۱۰۲۲ھ) صاحبِ کشف وکرامات اولیاء میں سے ہیں۔ انہوں نے ایک مدت تک شمس الدین رملیؒ کی صحبت اختیار فرمائی تھی، یہ خود بھی بلند پایہ فقیہ، محدث اور صوفی تھے۔ انہوں نے امام نوویؒ کی المنهاج کی مبسوط شرح لکھی تھی جس میں انہوں نے شمس الدین رملیؒ، خطیبؒ اور ابن حجرؒ کی شروحات کو جمع

---

(۱) المجددون فی الإسلام ص: ۲۸۳

(۲) لطف السمر وقطف الثمر ج: ۱ ص: ۱۸۰ الرقم: ۲۲

(۳) هدية العارفين ج: ۲ ص: ۲۶۱

(۴) لطف السمر وقطف الثمر ج: ۱ ص: ۱۸۲ الرقم: ۲۲

فرمادیا تھا، یہ شرح شوافع کے ہاں معتمد مانی جاتی ہے(۱)۔

آپ کے شاگردوں میں شیخ احمد شناویؒ بھی سرِفہرست ہیں، جنہوں نے مصر میں آپ سے استفادہ فرمایا۔(۲)

شیخ احمد شناویؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بخاری شریف کی سند میں چوتھے نمبر پر آتے ہیں۔آپ کی پیدائش مغربی مصر کے محلہ روح میں ہوئی تھی۔آپ بلند درجے کے محدث اور اعلی پائے کے صوفی تھے۔آپ کی زندگی بھی مدینہ منورہ میں گزری اور وفات بھی مدینہ منورہ میں ہوئی۔شیخ ابوطاہر مدنیؒ سے لے کر شیخ شناویؒ تک ، چاروں شخصیات کی زندگی مدینہ منورہ میں گزری اور وفات بھی مدینہ منورہ میں ہوئی۔

شیخ شناویؒ نے مصر میں شیخ شمس الدین رملیؒ سے حدیث حاصل کی تھی، یعنی حدیث کا یہ سلسلہ جو آج برصغیر میں عام ہے، یہ مصر میں تھا، وہاں سے شیخ شناویؒ کی برکت سے مدینہ منورہ پہنچا اور پھر مدینہ منورہ سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی برکت سے برصغیر پاک وہند تک پہنچا۔اللہ تعالی ان تمام بزرگوں کی قبور کو ٹھنڈا فرمائے، جنہوں نے یہ عظیم الشان خدمت سرانجام دی۔(آمین)

مذہبِ شافعیہ کے ادوار:

شمس الدین رملیؒ نے مذہبِ شافعیہ کی لازوال خدمت کی ہے ،آپ نے مذہبِ شافعیہ کی تنقیحِ ثانی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔آپ کے کام کا دائرہ کار سمجھنے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ امام شافعیؒ کے مذہب کے کئی ادوار ہیں، ہر دور میں مختلف علماء نے اس کی خدمت مختلف انداز میں کی ہے۔شمس الدین رملیؒ کی خدمات کا دائرہ سمجھنے کے لیے مذہبِ شافعیہ کا مختصر پسِ منظر سمجھنا ضروری ہے۔

اس کی تفصیل شیخ فہد بن عبداللہ الحمیشی نے **المدخل إلى مذهب الإمام الشافعي** میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان فرمائی ہے۔اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے:

امام شافعیؒ کے مذہب کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا دور تاسیسِ مذہب:

اس دور میں مذہبِ شافعیہ کی تاسیس ہوئی اور یہ دور، دو مراحل میں مکمل ہوا۔

پہلے مرحلے کو مرحلہِ عراقیہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں امام شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) مدینہ منورہ

---

(۱) ملخص من خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر ج: ۲ ص: ۴۵۶

(۲) خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر ج: ۱ ص: ۲۴۳

سے عراق کی جانب تشریف لے گئے تھے، مدینہ منورہ میں چونکہ امام شافعیؒ، مالکیہ علماء کے ہاں زیرِ تعلیم رہے، اس لیے اس دور میں آپ کے اقوال پر مالکیہ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اسے مذہبِ قدیم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ مذہب امام شافعیؒ سے چار شاگردوں نے نقل کیا:

۱: شیخ حسن زعفرانیؒ (المتوفی ۲۶۰ھ) ۲: امام احمد بن حنبلؒ (المتوفی ۲۴۱ھ)

۳: ابوثور کلبیؒ (المتوفی ۲۴۰ھ) ۴: ابوعلی کرابسیؒ (المتوفی ۲۴۵ھ)

دوسرے مرحلے کو مرحلہِ مصریہ کہا جاتا ہے۔ اس دور میں امام شافعیؒ نے اجتہاد سے کام لیا، اپنے بعض قدیم اقوال سے رجوع بھی فرمایا۔ ان لوگوں پر تشدید بھی فرمائی جو اب تک آپ کے پرانے فتاوی نقل فرمارہے تھے۔ الغرض اس دور میں مذہبِ شافعیہ ایک نئی شکل میں سامنے آیا۔ اس مرحلے کو مذہبِ جدید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ مذہب امام شافعیؒ سے چھ افراد نے نقل فرمایا:

۱: ابویعقوب البویطی (المتوفی ۲۳۱ھ) ۲: حرملہ بن یحی (المتوفی ۲۴۳ھ)

۳: ربیع الجیزی (المتوفی ۲۵۶) ۴: امام مزنی (المتوفی ۲۶۴ھ)

۵: یونس بن عبدالاعلی (المتوفی ۲۶۴ھ) ۶: ربیع المرادی (المتوفی ۲۷۰ھ)

دوسرا دور مذہب کی نشوونما اور اطراف میں پھیلنا:

اس دور میں وہ علماء سامنے آئے جنہیں اصحاب الوجوہ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ امام شافعیؒ کے بالواسطہ شاگرد ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے امام شافعیؒ کے تلامذہ یا ان کے تلامذہ کے تلامذہ سے علم حاصل کیا، ان لوگوں نے امامِ شافعیؒ کے اصول وقواعد کا لحاظ کرتے ہوئے امام کے کلام سے استنباط کیا اور وہ مسائل بیان کیے جن کے بارے میں امام شافعیؒ کی طرف سے کوئی صراحت منقول نہیں تھی۔ انہیں مجتہد مطلق نہیں کہا جاتا کیونکہ مجتہد مطلق کسی امام کی شروط کا پابند نہیں ہوتا جبکہ یہ طبقہ اپنے امام کی شروط کے تحت رہتے ہوئے استنباط کرتا ہے۔

اصحاب الوجوہ کی تعداد کثیر ہے اور یہ درجہ بدرجہ مختلف ادوار میں آئے ہیں، انہیں چند طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے:

طبقہ ثانیہ:

اس طبقے کے اصحاب الوجوہ درج ذیل ہیں:

۱: احمد بن یسار (المتوفی ۲۶۸ھ) ۲: محمد بن نصر المروزی (المتوفی ۲۹۴ھ)

طبقہ ثالثہ:

اس طبقے کے اصحاب الوجوہ درج ذیل ہیں:

۱:ابوالطیب بن سلمہ (المتوفی ۳۰۸ھ) ۲:ابوعبداللہ زبیری (المتوفی ۳۲۰ھ)

۳:ابن حربویہ (المتوفی ۳۱۹ھ) ۴:ابوحفص البابشامی (۳۱۰ھ کے بعد کسی سال میں فوت ہوئے)

۵:ابوعلی بن خیران (المتوفی ۳۲۰ھ)

۶:ابوبکر نیسابوری (المتوفی ۳۴۲ھ)

۷:ابوسعید الاصطخری (المتوفی ۳۲۸ھ) ۸:ابوبکر الصیرفی (المتوفی ۳۳۰ھ)

۹:ابن القاص (المتوفی ۳۳۵ھ) ۱۰:ابواسحٰق المروزی (المتوفی ۳۴۰ھ)

۱۱:ابوبکر الصبغی (المتوفی ۳۴۶ھ) ۱۲:ابوعلی بن ابی ہریرۃ (المتوفی ۳۴۵ھ)

۱۳:ابن الحداد (المتوفی ۳۴۴ھ) ۱۴:ابوعلی طبری

۱۵:ابوبکر الحمودی ۱۶:ابوحسن الصابونی

۱۷:ابن القطان (المتوفی ۳۵۹ھ) ۱۸:القفال الشاشی (المتوفی ۳۶۵ھ)

۱۹:ابن الھریس ۲۰:ابن سھل الصعلوکی (۴۰۴ھ)

۲۱:ابوزید المروزی (۳۷۱ھ) ۲۲:ابوحمد الجرجانی (المتوفی ۳۷۳ھ)

۲۳:الماسرجسی (المتوفی ۳۸۴ھ) ۲۴:ابوقاسم الصیمری (۳۸۶ھ کے بعد وفات ہوئی)

۲۵:زاہر السرخسی (المتوفی ۳۸۹ھ) ۲۶:ابن لال (المتوفی ۳۹۸ھ)

۲۷:خضری (المتوفی ۳۸۰ھ) ۲۸:ابوالحسن جوری

۲۹:ابوعبداللہ الحناطی

طبقہ رابعہ:

اس طبقے کے اصحاب الوجوہ درج ذیل ہیں:

۱:ابوطاہر الزیادی (المتوفی ۴۱۰ھ) ۲:ابواسحٰق اسفرایینی (المتوفی ۴۱۸ھ)

۳:ابوبکر البرقانی (۴۲۵ھ) ۴:ابوحاتم القزوینی (المتوفی ۴۴۰ھ)

۵:شریف ناصر العمری (المتوفی ۴۴۴ھ) ۶:ابوعبداللہ القطان

۷:ابوعبدالرحمٰن القزازی ۸:ابوعاصم العبادی (المتوفی ۴۵۸ھ)

۹:الشالوسی (المتوفی ۴۶۵ھ)　　۱۰:ابوخلف الطبری (المتوفی ۴۷۰)

اصحاب الوجوہ کا عراقی طریقہ:

اصحاب الوجوہ کا سلسلہ درجہ بدرجہ چلتا رہا، یہاں تک کہ شیخ ابوحامد المعروف بالاسفرائینی (المتوفی ۴۰۶ھ) کا دور آیا۔ ان پر بغداد میں شافعیہ کے علوم کی انتہا ہوتی تھی۔ان کو شافعیِ ثانی کہا جاتا تھا۔ان سے استفادہ کرنے والوں کا فروع کی تدوین میں ایک الگ سلسلہ قائم ہوا۔ جسے عراقیین کا طریقہ کہا جاتا ہے۔اس طریقہ کے حامل خاص خاص اصحاب الوجوہ کے نام درج ذیل ہیں:

۱: قاضی ابوالحسن ماوردی (المتوفی ۴۵۰ھ)　　۲: قاضی ابوالطیب الطبری (المتوفی ۴۵۰ھ)

۳: قاضی ابوعلی البندنیجی (المتوفی ۴۲۵ھ)　　۴:ابوالحسن احمد بن محمد محاملی (المتوفی ۴۰۵ھ)

۵:سلیم رازی (۴۴۷ھ کے بعد سمندر میں ڈوب کر فوت ہوئے)

اصحاب الوجوہ کا خراسانی طریقہ:

شیخ قفال المروزی (المتوفی ۴۱۷ھ) بھی ان نمایاں اصحاب الوجوہ میں سے ہیں، جن سے استفادہ کرنے والوں کا فروع کی تدوین میں الگ سلسلہ وجود میں آیا۔آپ سے استفادہ کرنے والے کچھ خاص حضرات کے نام درج ذیل ہیں:

۱: شیخ ابومحمد عبداللہ بن یوسف نیسابوری المعروف بالجوینی (المتوفی ۴۳۸ھ)

۲:ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن محمد فورانی مروزی (المتوفی ۴۶۱ھ)

۳: قاضی حسین بن محمد مروزیؒ (المتوفی ۴۶۲ھ)

۴:ابوعلی سنجیؒ (المتوفی ۴۲۷ھ)

۵:المسعودی

اس کے بعد کچھ ایسے اصحاب الوجوہ بھی آئے جنہوں نے عراقی اور خراسانی دونوں طریقوں کو نقل کیا۔اس نہج کا ایک الگ سلسلہ قائم ہوا۔امام الحرمین امام جوینیؒ (۴۷۸ھ) اور امام غزالیؒ (۵۵۰ھ) اور کچھ دیگر حضرات اس لڑی میں شامل ہیں۔

تیسرا دور استقرارِ مذہب:

اصحاب الوجوہ کی انتہائی کثرت کی وجہ سے اب اس چیز کی ضرورت تھی کہ مذہب کی تنقیح کی جائے، اور یہ بتایا

جائے کہ کون سا قول راجح ہے اور کون سا قول مرجوح۔لہٰذا اصحاب الوجوہ کے دور کے بعد مجتہدین فتوی کا دور آیا۔یہ وہ دور تھا جس میں استنباط کی بجائے ترجیح کا کام کیا گیا۔امام شافعیؒ سے لے کر اس دور تک کے مجتہدین کے اقوال میں سے شاذ اور غیر مرجوح اقوال کو الگ کیا گیا۔اسے مذہب کی تحریرِ اوّل بھی کہا جاتا ہے۔

یہ اہم معرکہ دو جلیل القدر شخصیات نے سَر کیا۔

۱:عبدالکریم بن محمد قزوینی رافعیؒ (المتوفی ۶۲۴ھ)۔آپ کی کتاب **المحرر** شوافع کی اہم کتب میں سے ایک ہے۔

۲: یحی بن شرف نوویؒ (المتوفی ۶۷۶ھ) آپ کی کتاب **المنہاج** شوافع کی اہم اور معتمد کتاب مانی جاتی ہے۔

ان دو حضرات کی کتب پر کئی جلیل القدر شخصیات نے حواشی اور شروحات تحریر کیں۔

چوتھا دور مذہب کی تحریرِ ثانی:

یہ دور امام رافعیؒ اور امام نوویؒ کے کام کا تکملہ ہے۔اس دور میں مذہب کی تحریرِ ثانی ہوئی،امام رافعیؒ اور امام نوویؒ کے کام کو باریک بینی سے دیکھا گیا اور جو امور رہ گئے تھے،انہیں پورا کیا گیا۔گویا مذہبِ شافعیہ کے عظیم الشان محل کی تعمیر میں جو خالی جگہیں رہ گئی تھیں،انہیں پُر کیا گیا۔امام رافعیؒ اور امام نوویؒ کی کتب پر کچھ کام تو چند علماء کی شروحات اور حواشی سے ہو چکا تھا۔تاہم اچھے خاصے امور باقی تھے۔(جن کی تفصیل آگے آرہی ہے)

یہ معرکہ دو حضرات نے سَر کیا۔

۱:ابن حجر ہیتمیؒ (المتوفی ۹۷۴ھ)

۲: شمس الدین محمد بن احمد رملیؒ (المتوفی ۱۰۰۴ھ)

ان دو حضرات نے شروحات لکھیں،کتب پر حواشی لکھے اور مذہب کو نئے سرے سے منقح و مہذّب کر کے پیش کیا۔اس دور کو مذہب کی تحریرِ ثانی کہا جاتا ہے۔(۱)

شمس الدین رملیؒ کی لازوال خدمات:

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات سامنے آ گئی کہ مذہب شافعیہ کے مختلف ادوار ہیں،اور ہر دور میں مختلف علماء نے مختلف انداز میں اس کی خدمت کی ہے۔آخر میں **ختامہ مسك** کے طور پر شمس الدین رملیؒ نے یہ خدمت سرانجام

---

(۱) **المدخل إلى مذهب الإمام الشافعي رحمه الله** (ص۲۶ تا ۶۱ سے ماخوذ)

دی۔آپ کے سامنے شافعیہ کی کتب کا ایک سمندر تھا ،جس میں آپ نے اترنا تھا۔ایک طرف اصحاب الوجوہ کی ایک لمبی قطار،جس میں کئی جلیل لقدر شخصیات شامل تھیں اور دوسری طرف امام رافعیؒ اور امام نوویؒ کے علوم کی تنقیح ، جو جوئے شیر لانے کے مترادف تھی۔یقیناً یہ ایک عظیم الشان خدمت تھی،جس کی توفیق آپ کو رب ذوالجلال کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔

اصحاب الوجوہ کا کام اصلاً امام رافعیؒ وامام نوویؒ دیکھ چکے تھے،اس لیے یہ کام تو تقریباً ہو چکا تھا تاہم رہ جانے والے خلا کو پُر کرنے کے لیے اصحاب الوجوہ کے کیے گئے کام کی بصیرت بھی کما حقہ ضروری تھی۔اس کام میں آپ کے علاوہ ابن حجر ہیتمیؒ نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔

آپ کے سامنے درج ذیل امور موجود تھے:

۱:امام نوویؒ کی کتب میں ترجیح اور تصحیح کا اختلاف باقی تھا،ان کی بعض کتب میں ایک مذہب کو صحیح کہا گیا اور بعض میں دوسرے کو،لہذا ترجیح کی ضرورت تھی۔

۲:امام نوویؒ بھی بہرحال بشر تھے،انہوں نے بعض غیرِ صحیح مسائل کو صحیح کہا،اور بعض غیرِ راجح کو راجح کہا۔ان اقوال کو پرکھنا بھی ضروری تھا۔

۳:مذہب کے اختلافی مسائل میں امام نوویؒ سے مختلف آراء منقول تھیں اور ان میں کسی رائے کی تصحیح بھی نہیں تھی۔ان اقوال میں تصحیح کی ضرورت تھی۔

۴: کچھ ایسے مسائل بھی تھے جن پر متقدمین نے کلام کیا تھا لیکن امام رافعیؒ اور امام نوویؒ سے کسی کی تصحیح منقول نہیں تھی۔ایسے اقوال میں تصحیح کی ضرورت تھی۔

۵: کچھ جدید مسائل بھی تھے جن سے دونوں اماموں نے تعرض نہیں کیا تھا۔ان کا حکمِ شرعی بیان کرنا بھی ضروری تھا۔

۶: شیخینؒ کی کتب میں تعارض تھا،خصوصاً امام نوویؒ کی تصحیح میں یہ تعارض موجود تھا،مثلاً کسی کتاب میں جواز کو صحیح کہا گیا اور کسی میں حرمت کو،اس تعارض کو ختم کرنے کی ضرورت تھی۔(۱)

اس کام کی تکمیل کے لیے شمس الدین رملیؒ نے ہمہ جہتی خدمات سرانجام دیں۔حواشی لکھے،شروحات تحریر کیں، یہاں تک کہ ہر شافعی عالم آپ کی تصنیفات کی جانب محتاج ہو گیا۔شمس الدین رملیؒ کو اسی بنا پر دسویں صدی کا مجدد بھی

(۱)ملخص من "المدخل إلى مذهب الإمام الشافعي رحمه الله" ص ۱۶ (تحت الدور الرابع)

کہا جاتا تھا، کیونکہ آپ کی کتب سے انتفاع ہر شافعی عالم کی ضرورت تھی۔ آپ کو شافعیِ صغیر کا لقب بھی دیا گیا۔ آپ کی کتاب نهاية المحتاج الى شرح المنهاج خاصی مقبول ہوئی۔ اسے آج بھی شوافع کی اہم اور معتمد کتب میں شمار کیا جاتا ہے۔

وفات: اب وہ زمانہ قریب آچکا تھا جو ہر ذی روح کا مقدر ہے، سانسوں کی مالا ٹوٹنے کے قریب تھی اور مصر میں علوم ومعارف کا ایک دَر بند ہُوا جارہا تھا۔ علوم ومعارف کے دریا بہانے کے بعد بالآخر اجل کی دعوت پر لبیک کہا۔ آپ کی وفات ۱۳ جمادی الاولی ۱۰۰۴ھ کو دن کے وقت مصر میں ہوئی۔ (۱)

آپ کی وفات سے متعلقین پر کیا کرب گذرا ہوگا، اس کی کچھ جھلک آپ کے شاگرد، ولی کامل، شیخ عبدالقادر بن محمدؒ (المتوفی ۱۰۲۲ھ) کے ذیل کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے:

واحر قلبی علی حبر قضی ومضی — لو کان یفدی فدته العین بالبصر

فالعین تدمع والقلب حزین غدا — بجمرة أوقدت باللهب والشرر

لفقد شمس الله سیدنا — ومن هدی الناس من بدو ومن حضر

محمد العالم المفضال من سطعت به الفضائل فی العلیاء کالقمر (۲)

ترجمہ:

''میرا دل ایک بڑے عالم کی وفات پر جل رہا ہے جن کا عہد تمام ہوا، اگر ان کا فدیہ دینا ممکن ہوتا تو میں اپنی آنکھیں بینائی سمیت فدیے میں وار دیتا۔

اب حال یہ ہے کہ آنکھیں برس رہی ہیں اور غمگین دل بھڑکتے ہوئے انگارے میں تبدیل ہو چکا ہے۔

ہمارے سردار اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن سورج کے کھو جانے پر، جنہوں نے ہر دیہاتی اور شہری کو ہدایت کی روشنی عطا فرمائی۔

یعنی عالم، فاضل، محمد (شمس الدین رملیؒ) کے کھو جانے پر، جن کے فضائل آسمان میں چاند کی طرح روشن ہیں۔''

اللہ تعالی آپ کی قبر کو بقعۂ نور بنائے اور آپ کے فیض کو رہتی دنیا تک جاری وساری فرمائے۔ آمین

---

(۱) خلاصة الأثر فی أعیان القرن الحادی عشر ج: ۳ ص: ۳۴۷

(۲) خلاصة الأثر فی أعیان القرن الحادی عشر ج: ۲ ص: ۴۵۶

دینی مدارس میں تحقیقی کلچر کو فروغ دینے کی ضرورت

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتیؒ کا منہج فکر

مولانا اسداللہ خان پشاوری

خلاصۂ مضمون:

یہ مقالہ دینی مدارس میں تحقیقی مزاج کے فروغ کی ضرورت اور اس ضمن میں مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتیؒ (1347ھ 1442ھ) کے علمی وفکری منہج کے بارے میں ہے۔ مولانا چشتیؒ نہ صرف مدارس کے فاضل تھے بلکہ جدید جامعات میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے مختلف میدانوں میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کی پوری زندگی اس بات پر صرف ہوئی کہ مدارس کے طلبہ میں تحقیقی شعور بیدار ہو اور علمی وسائل بالخصوص کتب خانوں تک طلبہ کی براہِ راست رسائی ممکن ہو۔

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتیؒ، ایک علمی وتحقیقی شخصیت:

مولانا چشتیؒ ایک ایسے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں دینی وتحقیقی سرگرمیاں روزمرہ کا حصہ تھیں۔ ان کے بڑے بھائی مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ ممتاز محدث ومحقق تھے، جبکہ والد منشی عبدالرحیم خاطر کا تعلق طباعتِ کتب کے پیشے سے تھا اور وہ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن سے وابستہ رہے۔ چشتی صاحبؒ نے دینی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی اور 1950ء میں فراغت پائی۔ بعدازاں پاکستان آکر عصری تعلیم مکمل کی اور 1981ء میں کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے پیشہ ورانہ سفر میں درج ذیل اہم مرحلے شامل ہیں:

(1) لیاقت نیشنل لائبریری کراچی (1955ء 1969ء) میں کتب خانہ کے منتظم۔ (2) بیرو یونیورسٹی کانو، نائجیریا (1977ء/ 1987ء) میں سینئر لائبریرین۔ (3) جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی (1990ء تاوفات) میں تخصص فی الفقہ والحدیث کے استاد ومشرف۔

ان کی نمایاں تصانیف میں فوائد جامعہ شرح عجالہ نافعہ، اسلامی کتب خانے (عہد عباسی کے کتب خانوں پر مفصل تحقیق)، عہد رسالت میں صحابہ کرام کی فقہی تربیت، مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علمی کارنامے، تذکرہ جلال الدین سیوطی، تذکرہ رحیمیہ اور کثیر تعداد میں علمی وتحقیقی مقالات ورسائل شامل ہیں۔(۱)

مدارس واہل مدارس کے لیے چشتی صاحبؒ کی سوچ وفکر کو ہم چھ عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(1) کتب خانہ کی اہمیت (2) درسی امالی اور تقریروں کا نقصان۔(3) عملی طور پر کام کروانا۔ (4) تحریری صلاحیتیں اجاگر کرنا۔(5) معاشی استحکام۔(6) صحت وتندرستی۔

(1) کتب خانہ کی اہمیت:

مولانا چشتی صاحبؒ چونکہ خود مدارس سے وابستہ رہے، اس لیے انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ اکثر مدارس میں تحقیقی ماحول موجود نہیں۔ان کے نزدیک اس کمی کی بنیادی وجہ کتب خانوں تک طلبہ کی محدود رسائی تھی۔مولانا چشتی صاحبؒ کے دل میں اس کا درد تھا، اس لیے وہ اکثر اپنے درد کا اظہار کرتے تھے، اس اظہار سے کبھی کبھی بعض لوگ اپنی سمجھ کے مطابق غلط مطلب بھی حاصل کر لیتے تھے، لیکن وہ لوگ مولانا چشتی صاحبؒ کی بات کے مقصد تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ چنانچہ مولانا چشتی صاحبؒ اپنے زمانۂ طالب علمی (دارالعلوم دیوبند) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری طالب علمی کا زمانہ ایسا تھا جب دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں کتابیں مقفل (Lock and key) میں رکھی جاتی تھیں، اس سے پہلے بھی یہی دستور تھا، یعنی طلبہ کو نصابی کتاب کے علاوہ کتب خانہ کی کسی اور کتاب کے استعمال کی اجازت تھی نہ کتب خانے میں آنے کی، بلکہ کتب خانہ کے دروازے پر ایک لمبی تپائی پڑی رہتی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ درسی کتاب آغاز سال میں ایک مرتبہ لے جائیں، اور اختتام سال امتحان کے بعد اس تپائی پر واپس کر کے گھر چلے جائیں، کتب خانہ میں داخل نہ ہوں، کتابیں صرف استادوں کے استعمال میں رہتی تھی، کسی حاشیہ اور شرح سے استفادہ کی اجازت طالب علم کو نہ پہلے تھی، نہ میرے زمانے میں اٹھی تھی، میں جب تک وہاں رہا اس عرصہ میں کسی مہمان کو کتب خانہ دکھانے لے جاتے تو پھر کہیں کتابوں پر نظر پڑتی۔''(۲)

چونکہ مولانا چشتی صاحبؒ کو اس کا افسوس تھا، اس لیے انہوں نے اپنا مزاج ایسا بنایا تھا کہ اپنے طلبہ کو کتابیں فراہم کرتے تھے، ان کی رہنمائی کرتے تھے۔البتہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے جس دور کی بات کی ہے، یہ اس دور کے اعتبار سے ہے ورنہ اب تو دارالعلوم دیوبند میں صورت حال کافی تبدیل ہے۔

چشتی صاحبؒ مزید لکھتے ہیں:

'میں اپنے وطن جے پور (راجستھان) سے چھٹیاں گزار کر شوال میں جاتا، مجھے درسی کتابوں کے ایسے نسخے ملتے تھے جس میں چور کی حاشیہ ہوتے تھے۔وہ کتابیں اپنی عمر کے دن گن رہی ہوتی تھیں، انہی کو پڑھتا رہتا تھا، میرے ہم سبق مولانا فیض علی شاہؒ، ذکی کیفیؒ، مولانا سید حامد میاںؒ (بانی جامعہ مدنیہ لاہور)، مولانا محمد سالم (مُہتمم دارالعلوم

وقف دیوبند) وغیرہ تھے، ان کے پاس کتابوں کے اچھے نسخے ہوتے تھے، یہ شروع دنوں میں کتابیں لیتے تھے''۔(۳)

تحقیق کے لیے کتب خانہ کا قیام فرائض میں سے ہے، لیکن بیشتر مدارس میں کتب خانے نہیں ہیں، اور جہاں موجود ہیں وہاں طلبہ کے استفادے کی کوئی صورت نہیں، ذیل کے اقتباس میں چشتی صاحب نے مدارس میں کتابوں کی استعمال کی پابندی کی عمومی وجوہات بھی ذکر کی ہیں وہ لکھتے ہیں:

''طلبہ کو کتب خانہ میں کتابوں کے استعمال پر پابندی کی بہت سی وجوہ ہوسکتی ہیں: (1) جگہ کی کمی۔(2) عملہ کی کمی۔(3) طلبہ کی کثرت۔(4) مطالعہ کی اجازت کی صورت میں اسباق سے غفلت۔(5) غیر موضوع کی کتابوں میں وقت کی بربادی۔(6) کتابوں کے استعمال میں بے احتیاطی۔ بہرحال جو بھی توجیہ کی جائے وہ دل کو نہیں لگتی۔ طلبہ جب کتابوں کے نام اور مصنفین کے مراتب اور ان کے طبقات سے بے بہرہ رہیں گے انہیں علم کی ہوا کہاں سے لگے گی؟ ذہین اور ذکی طلبہ آئندہ پڑھانے کی خاطر درسی کتاب شوق سے یاد کرتے تھے، اس سے ان کی معلومات کتاب کی حد تک محدود ہوکر رہ جاتی تھی، انہیں لکھنے کا موقع نہ ملتا تھا اس لیے کہ لکھنے کے لیے کتابیں ہونی چاہئیں، انہیں سہولت میسر نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ دیوبند سے اہل قلم خال خال ہی نکلے ہیں مدرسین کی ہر جگہ کثرت ہے۔

علمی تربیت کی ہر شعبہ میں بہت کمی ہے، ذہین زکی طلبہ کو درسی کتابیں زبانی یاد ہوتی تھیں لیکن فن پر نظر نہ ہوتی تھی نہ آئندہ اس کی کوئی راہ نظر آتی تھی، اس لیے کہ اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ ذاتی کتابیں خریدیں، اکثر کے پاس صحاح ستہ تک نہیں ہوتی تھیں۔''(۴)

مولانا چشتی صاحبؒ کے ایک شاگرد مولانا عامر خالد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''آپ ہر ادارے اور عالم دین کے لیے ایک وسیع مکتبہ کے خواہش مند تھے اور کتابیں خریدنے پر زور دیتے، آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی کتب خانوں سے متعلق تھا، عمر کا ایک معتد بہ حصہ کتابوں اور کتب خانوں میں گزرا، اداروں میں بلند و بالا پرشکوہ عمارات پر توجہ اور کتاب سے بے اعتنائی پر افسوس کا اظہار کرتے، فرماتے: "طالب علم کو کتاب سے غرض ہے، جسے تھام کر درخت کے نیچے بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا ہے اور اگر طالب علم کو کتابیں میسر نہ ہوں تو کیا کرے گا؟" ایک دفعہ استاذ محترم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد مولانا ساجد احمد صدوی صاحب (سابق نگران شعبہ تخصص علوم حدیث، جامعہ فاروقیہ کراچی) کی کاوش سے استاذ محترم کی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ سے ملاقات طے پائی، ہم چند طلبہ بھی ساتھ ہولیے، بیٹھتے ہی سلام دعا کے بعد پہلا سوال استاذ جی کا کتابیں خریدنے سے متعلق تھا، حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: "تقریباً لاکھ ڈیڑھ کی کتابیں خرید لی ہیں، تو استاذ جی نے

فرمایا: ”یہ کافی نہیں، مزید خریدی جائیں۔ تو مولانا نے حامی بھر لی۔“ (۵)

خود چشتی صاحبؒ مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ کے بارے میں لکھے ہوئے اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

”مدرسہ کے لیے وصول کردہ رقم کے استعمال کرنے میں بھی بہت احتیاط برتتے تھے، جس کی بنا پر بسا اوقات ایسی جگہ پر پیسہ خرچ کرنے سے بھی رک جاتے تھے جہاں رقم خرچ کرنی چاہیے، خصوصا جب بڑا ادارہ ہو تو اس کی علمی ضروریات بھی کافی بڑھ جاتی ہیں، مثلا کتابوں کی خریداری ایک ایسا معاملہ ہے کہ ہر وہ مدرسہ جس میں کتابوں کی کثرت ہو اور طلبہ میں مطالعہ کے ذوق کی آبیاری کی جائے تو ان کی استعداد میں خاصی ترقی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد رضا بجنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت بنوری رحمہ اللہ علیہ پر بہت اصرار کیا کہ وہ ”معارف السنن“ کو جلدی مکمل کریں اور اسی دوران وہ جامعہ میں تشریف لائے اور طلبہ کے زیر مطالعہ کتابیں دیکھیں تو حضرت بنوریؒ سے تکمیل کتاب پر اصرار ترک کر دیا، وجہ یہ لکھی: تخصص کے طلبہ کے کمروں کو دیکھا کہ ان میں مطالعہ کے لیے کتابوں کی اتنی وافر تعداد ہے جو بعض بڑے مدارس کے اساتذہ کے یہاں بھی نہیں دیکھی، ان باتوں کو دیکھ کر میں اتنا متاثر ہوا کہ معارف السنن کام کے سلسلہ میں مولانا پر کچھ بھی زور نہ دے سکا۔“ (خدام الدین، حضرت بنوری نمبر، ص:112)۔

لیکن مولانا حبیب اللہ صاحب طلبہ کی رقم خرچ کرنے میں احتیاط کی وجہ سے مدرسہ کے لیے کتاب خریدنے میں بھی تامل کرتے اور پوچھ تاچھ کے بعد کوئی کتاب مدرسہ کے لیے خریدتے تھے۔ (۶)

مولانا سلمان حسن صاحب، مولانا چشتیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”چشتی صاحب فرماتے تھے: آج مساجد اور مدارس کی جدید عمارتوں پر پیسہ خرچ کرنا آسان ہے، لیکن کتابوں کے خریدنے اور لائبریریاں بنانے اور ان کو آباد کرنے پر خرچ کرنے کے لیے کوئی بھی آمادہ نہیں، اکثر مکتبات کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ایک مرتبہ بندہ نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں مدرسہ ابن عباس کا مکتبہ صبح فجر کے بعد سے رات ایک بجے تک کھلا رہتا ہے اور طلبہ کرام اس سے استفادہ کرتے رہتے ہیں، اس پر بڑی خوشی کا اظہار فرمایا“۔ (۷)

(2) درسی امالی، فوائد اور خامیاں

عام طور پر مدارس میں طلبہ، اساتذہ کی تقریریں قلم بند کرتے ہیں، چشتی صاحبؒ اساتذہ کی درسی تقریروں (امالی) پر بھی تنقید کرتے تھے۔ ان کے مطابق: یہ امالی اکثر استاد کی نظر سے نہیں گزرتیں، اس لیے ان میں خامیاں رہ جاتی ہیں۔ بعض میں حوالہ جات کا فقدان ہوتا ہے، اور بعض اوقات دوسروں کی تحقیقات بلا حوالہ شامل کر لی جاتی

ہیں۔اس صورت میں یہ امالی محقق کے لیے معتبر ماخذ نہیں رہتیں۔انہوں نے مثال کے طور پر حضرت گنگوہیؒ، شیخ الہندؒ، سید انور شاہ کشمیریؒ اور دیگر اکابر کی درسی امالی کا حوالہ دیا اور ان میں تدوین وتحقیق کی ضرورت پر زور دیا۔

چشتی صاحبؒ فرماتے ہیں:

''استادوں کی درسی امالی میں نقائص کی بنیادی وجہ کتب خانوں سے کتابوں کے استعمال پر پابندی ایک اہم عنصر تھا اور ہے، دارلعلوم دیوبند کے کتب خانے سے استفادہ کی اجازت نہ تھی، اس لیے طلبہ کو مشکوٰۃ المصابیح اور دورۂ حدیث کے سبق میں شیخ الحدیث اور اساتذۂ حدیث کی درسی تقریریں لکھتے رہتے تھے، یہی وہ مطالعہ میں رکھتے اور کام نکالتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت گنگوہیؒ (1244ھ۔1323ھ) اور شیخ الہندؒ (1268ھ۔1330ھ) کی درسی امالی میں بہت سی توجیہیں نہایت مختصر اور الہامی ہوتی تھیں، ذہین فطین طلبہ سمجھ کر لکھتے تھے، ان سے صحاح ستہ حل ہوجاتی ہے، چنانچہ مولانا یحییٰ کاندھلویؒ (1288ھ۔1334ھ) نے حضرت گنگوہیؒ کی درسی تقریریں سمجھ کر لکھی تھی، ان میں کتابوں کے حوالے نہیں تھے، وہ طبع زاد تھیں بآسانی قید تحریر میں آ گئی تھیں وہ درست ہیں۔

درسی امالی لکھنے میں خرابی یہ ہے کہ ذرا بھی ذہن ادھر ادھر ہوا مطلب تک رسائی ممکن نہیں رہتی، شیخ الہندؒ کی درسی تقریروں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے، دو چار زود نویس اور نہایت ذہین ومستعد طلبہ کی درسی کاپیاں سامنے رکھی جائیں تو غور کرنے سے مطلب تک رسائی ہوجاتی ہے ورنہ مطلب کی ترجمانی ایک دو کاپیوں سے پوری نہیں ہوتی۔شیخ الہندؒ کی اردو، درسی تقریروں کا مجموعہ شائع کیا گیا تھا، ایک مجموعہ راقم سطور کے کتب خانے میں بھی موجود ہے، اس سے زیادہ صاف اور بہتر نسخہ قاری سید شریف احمد تھانوی زید مجدہ کے پاس موجود ہے، ایڈٹ کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

ان درسی تقریروں میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ طلبہ کی یہ املائی کاپیاں استاد کی نظر سے نہیں گزرتی ہیں، اس لیے ان میں بہت سی خامیاں رہ جاتی ہیں اور عقیدت مند ایسے ہی انہیں شائع کرتے ہیں، نو وارد طلبہ انہیں خریدتے اور کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ کاپیاں قابل اعتماد نہیں ہیں۔

مولانا محمد چراغ (1314ھ۔1409ھ) نے سید انور شاہؒ کی ترمذی کی تقریر لکھی اور اس کا ایک نسخہ حضرت شاہ صاحبؒ کو پیش کیا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موصوف کو دیکھنے کا وقت نہ ملا اس لیے تقریظ بھی نہیں لکھی ایسی صورت میں وہ قابل اعتماد ومستند کیونکر قرار پاسکتی ہے۔

بخاری کی درسی تقریر ''فیض الباری'' چونکہ سید انور شاہؒ کی نظر سے نہیں گزری اس میں نقائص موجود ہیں، ضرورت

ہے کہ اس پر بالغ نظر ارباب فکر ونظر کی ایک جماعت غور کرے اور اس کے مراجع دیکھے، پھر اسے شائع کیا جائے، بلاشبہ اس پر علامہ شیخ محمد زاہد الکوثریؒ (1296ھ۔ 1371ھ) نے نظر ڈالی ہے، وہ علامہ کی طائرانہ نظر ہے، موصوف نے بہت سی غلطیاں دور کی ہیں، پھر بھی اس پر کام کی ضرورت ہے، آپ نے دیکھا طلبہ پر کتب خانہ میں کتابوں کے دیکھنے پر پابندی نے کیا گل کھلائے ہیں؟

مولانا گیلانی نے سید انور شاہؒ سے جب صحیح مسلم پڑھی، درسی تقریر بھی لکھی، انہیں اس امر کا اعتراف ہے کہ یہ اچھی طرح نہیں لکھی جاسکی، اس لیے کہ ان کی درسی تقریر لکھنا مشکل ترین کام تھا، ان کی درسی تقریر کو ضبط تحریر میں لانا طالب علم کے بس کی بات نہ تھی، پھر بھی علمی جواہر پاروں سے مرصع تھی، وہ انہیں جان سے زیادہ عزیز تھی، مولانا گیلانی کی یہ درسی تقریر کسی طالب علم نے اڑالی، مولانا گیلانیؒ نے بہت واویلا کیا لیکن فائدہ نہ ہوا، انہیں عمر بھر اس کا قلق رہا، یہ دکھ بھری کہانی جب یاد آتی تو فارسی کا یہ شعر بڑی حسرت سے پڑھتے تھے: آنچہ ازمن گم شدہ، گراز سلیماں گم شدے۔ ہم سلیماں ہم پری، ہم اہرمن بگریستے۔

امالی صحیح مسلم کا یہ مجموعہ کسی طرح علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (1305ھ۔1369ھ) کے ہاتھ آ گیا تھا، موصوف نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں اس سے استفادہ کیا اور امالی کا حوالہ بھی دیا ہے، ہمیں مولانا یوسف بنوریؒ کے توسط سے یہ مجموعہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے چھوٹے بھائی فضل احمد عثمانی سے دیکھنے کے لیے ملا تھا، گو یہ مجموعہ زیادہ ضخیم نہیں مگر علامہ انور شاہؒ کے علوم کا آئینہ دار اور بہت سے علمی فوائد سے آراستہ ہے۔

آج کل کتابوں کی بھرمار ہے، کسی درسی امالی کو کیونکر سندی حیثیت حاصل ہوسکتی؟ جب کوئی اعتراض کیا جاتا ہے شیخ الحدیث اور استاد حدیث یہ کہہ کر چھوٹ جاتا ہے کہ یہ طالب علم نے لکھا ہے، میں نے نہیں لکھا، جہاں استاد یہ کہیں غور فرمائیں! ان کا پیوں کی بھلا کیا حیثیت ہے؟ پھر یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ایسے استادوں کی کاپیاں جنہوں نے عمر بھر کبھی کوئی تحقیقی کتاب نہیں لکھی، کوئی تحقیقی مقالہ پیش نہیں کیا، اسے کبھی سند کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے؟ اس زمانے میں بعض درسی تقریروں میں اہل علم کی تحقیقات بغیر حوالہ درج کی جانے لگی ہیں، اس سے لائق شاگردوں کی نظر میں استاد کا وقار مجروح ہوتا ہے۔(۸)

(3) عملی طور پر کام کروانا

چونکہ عام طور پر مدارس میں تعلیم وتعلم کا طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ استاذ تقریر سنا کر چلا جاتا ہے اور طلبہ سن لیتے ہیں، چشتی صاحبؒ اس طریقہ کے بھی خلاف تھے، ان کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ سے کام کرواتے تھے، کوئی بھی کتاب شروع کروا کر اس میں مختلف عنوانات پر طلبہ سے لکھواتے تھے، پھر زیر درس کتاب کے مضمون کا دوسری کتاب سے

تقابل کرواتے تھے۔اس دوران طلبہ کی رہنمائی کرتے تھے۔

مولانا محمد طفیل کوہاٹی، مولانا چشتی صاحبؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں:''مدارس میں استاذ کا کتاب کی تقریر کرنا اور شاگرد کا سننا اس دور کی روایت ہے جب درسی کتب کے نسخوں کی کمی ہوتی تھی، مجبوراً استاذ اپنے نسخے سے پڑھاتا اور طلبہ ضبط کرتے، یہ مجبوری کے درجے میں تھا۔مثالی طرز یہ ہے کہ طالب علم کے پاس اپنا نسخہ ہو، اسے حواشی وشروح دستیاب ہوں، وہ خود مطالعہ کر کے سنائے اور استاذ محض اس کی رہنمائی کرے۔طلبہ پر بوجھ ڈالو گے تو ان کے جوہر کھلیں گے۔اب تو علم رخصت ہو گیا ہے صرف رسم باقی رہ گئی ہے۔''(۹)

چشتی صاحبؒ کی وفات کے بعد ماہنامہ بینات کے چشتی نمبر کے لیے ان کے شاگردوں اور مستفیدین نے جو مضامین لکھے ہیں، ان مضامین کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ چشتی صاحبؒ کیسے عملی طور پر اپنے طلبہ کی رہنمائی کرتے تھے۔

(4)تحریری صلاحیتیں اجاگر کرنا

مدارس کے طلبہ میں عمومی طور پر تحریری صلاحیتیں کمزور ہوتی ہیں، چشتی صاحب فرماتے تھے کہ شروع کے درجات سے طلبہ کی تحریری صلاحیتوں کو پنپنے دینا چاہیے، تاکہ وہ جب تخصص میں پہنچے تو وہ علمی وتحقیقی مقالہ لکھنے کے قابل ہوں۔

چنانچہ مولانا محمد عارف صدیق صاحب لکھتے ہیں:

''استاذ محترم اکثر اپنے سبق میں لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔آپ پہلے سوال کرتے تھے: میاں! فراغت کے بعد کیا کرو گے؟ تو اکثر ساتھیوں کا جواب یہ ہوتا تھا کہ استاذ جی! پڑھاؤں گا، اس پر استاذ جی فرماتے تھے: جس سے پوچھو کہتا ہے پڑھاؤں گا، لکھنا تمہیں آتا نہیں، پڑھاؤں گا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں تو دو وقت تعلیم ہوتی تھی، جس میں لکھنا اور پڑھنا دونوں کام ہوتے تھے اور تمہارے ہاں لکھنا تو سرے سے ہے ہی نہیں۔پھر آپ قرآن مجید میں سے سورہ فرقان کی یہ آیت پڑھتے: وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (الفرقان:5)۔پھر فرماتے:"میاں لکھا کرو، لکھنے سے انسان ہمیشہ زندہ رہتا ہے، اور فرماتے تھے: شبلی (مولانا شبلی نعمانی) کو پڑھا کرو، تمہیں لکھنا آجائے گا، اس لیے کہ شبلی علمی زبان لکھتا ہے۔(۱۰)

(5)معاشی استحکام

چشتی صاحبؒ کے نزدیک علمی وتحقیقی زندگی کے لیے معاشی طور پر اکثر مستحکم زندگی ضروری ہے، معاشی طور پر آسودہ شخص سکون کے ساتھ علمی زندگی گزار سکتا ہے، جو شخص معاشی طور پر غیر مستحکم صورت حال سے دوچار ہوگا وہ

سکون کے ساتھ علمی کاموں میں نہیں لگے گا۔ اس لیے ہم نے چشتی صاحبؒ کے ہاں بارہا اس کو دیکھا تھا کہ وہ ہر ملنے والے شخص سے ان کی معاشی صورت حال کے بارے میں ضرور پوچھتے تھے، اگر کوئی معاشی طور پر بہتر ہوتا تو بہت خوش ہوتے تھے۔

چونکہ مدارس کے طلبہ اور اس میں پڑھانے والے اساتذہ معاشی طور پر مستحکم نہیں ہوتے، اس لیے چشتی صاحبؒ اپنے طلبہ کو یونیورسٹیوں میں مزید تعلیم کی طرف متوجہ کرتے تھے، انہوں نے چونکہ وہاں کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا کہ وہاں علمی وتحقیقی ماحول ہوتا ہے، لائبریری ہوتی ہے، معاشی زندگی کو بہتر بنانے کے مواقع ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ ان یونیورسٹیوں میں گھس جاؤ اور سکون کے ساتھ اپنا علمی کام کرو۔

چنانچہ مولانا محمد عابد لکھتے ہیں:

''یکم رجب المرجب 1432ھ/ 4 جون 2011ء بروز ہفتہ جامعہ مدنیہ جدید میں ختم بخاری شریف کے موقع پر ایک تقریب کا انعقاد ہوا۔ حضرت چشتی صاحب نے بخاری شریف کی آخری حدیث پڑھا کر مختصر بیان فرمایا اور اختتامی دعا فرمائی، بیان میں حضرت چشتی صاحب نے طلبہ کو ہنر اور فن سیکھنے کی ترغیب دی، بیان کے بعد حضرت مولانا سید محمود میاں صاحب مدظلہم کو بھی اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ مدرسہ میں طلبہ کو کوئی ہنر سکھائیں، آئندہ زندگی میں یہ کام آئے گا۔ حضرت مولانا سید محمود میاں صاحب مدظلہم نے حضرت چشتی صاحب سے اس کام کی حامی بھر لی اور آئندہ سال تعلیمی سال شروع ہوتے ہی 18، ذوالقعدۃ/ 17 اکتوبر بروز پیر جامعہ مدنیہ جدید میں شعبہ برقیات کے تحت دارالصناع کا اجراء کیا، جامعہ مدنیہ جدید کے اس بلاک میں باقاعدہ اس چیز کا اہتمام کیا کہ وہاں طلبہ کو کمپیوٹر ہارڈ ویر، سافٹ ویئر سکھائے جائیں، نیز الیکٹریشن کا کام، مزید بھی کئی چھوٹے چھوٹے ایسے ہنر اور فن سکھائے جائیں جو طلبہ کو آئندہ زندگی میں معاون بن سکیں۔ آئندہ سال 2012ء میں حضرت چشتی صاحب تشریف لائے تو اُستاذ محترم حضرت مولانا سید محمود میاں صاحب مدظلہم نے حضرت چشتی صاحب کو یہ کارروائی بتائی جس پر حضرت چشتی صاحب نے حضرت مولانا سید محمود میاں صاحب مدظلہم کو بہت دعائیں دیں اور بہت خوشی کا اظہار فرمایا۔''(۱۱)

(6)صحت وتندرستی

چشتی صاحب کے نزدیک صحت وتندرستی کی بہت اہمیت تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ علمی وتحقیقی زندگی کے لیے صحت مند جسم ودماغ ضروری ہے۔ آپ نے نوے سے زائد برس کی عمر پائی لیکن آخر تک صحت مند اور متحرک رہے۔ اس کی بڑی وجہ آپ کی معتدل زندگی، سادہ خوراک اور صحت بخش معمولات تھے۔ آپ کھانے میں سادگی،

میانہ روی اور باقاعدگی کے قائل تھے۔ وقت پر کھانا، زیادہ نہ کھانا، اور بھاری غذا سے پرہیز آپ کی نمایاں عادت تھی۔ جسمانی چستی کے لیے آپ سیر اور حرکت کو اہم سمجھتے تھے۔ ذہنی سکون اور طہارتِ نفس کے لیے قرآن کی تلاوت، اذکار اور روحانی معمولات کو لازمی سمجھتے تھے۔ آخر تک آپ کی قوتِ بینائی اور یادداشت اچھی رہی، جس کا تعلق انہی اصولوں سے تھا۔

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتیؒ کی صحت وتندرستی سے متعلق بعض عادات کے بارے میں بندہ کا الگ سے ایک مضمون موجود ہے، اس کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

نتائج بحث:

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتیؒ نے دینی مدارس کے لیے ایک ایسا منہج فکر پیش کیا جو صرف درس وتدریس تک محدود نہیں تھا بلکہ تحقیق، تحریر، کتب خانوں کی افادیت، معاشی استحکام اور صحت مند طرزِ زندگی تک محیط تھا۔ ان کے افکار آج بھی مدارس میں تحقیقی کلچر کے فروغ کے لیے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ مدارس اگر ان خطوط پر اپنی پالیسی وضع کریں تو طلبہ میں تحقیقی صلاحیتیں پروان چڑھ سکتی ہیں، اور یوں مدارس علمی وفکری میدان میں مزید مؤثر کردار ادا کرسکیں گے۔

حوالہ جات:

(۱) ان احوال کے لیے ملاحظہ ہو ماہنامہ بینات کراچی، خاص نمبر، ۲۰۲۴ء

(۲) مقدمہ، ہزار سال پہلے، ص: ۳۶، بیت العلم کراچی، ۲۰۰۴ء (۳) ایضاً

(۴) مقدمہ، ہزار سال پہلے، ص: ۳۷، بیت العلم کراچی، ۲۰۰۴ء

(۵) ماہنامہ بینات کراچی، مولانا چشتی صاحبؒ خاص نمبر، ص: ۴۷۲

(۶) ماہنامہ بینات کراچی، خاص نمبر مولانا حبیب اللہ مختارؒ، ص: ۴۹

(۷) ماہنامہ بینات کراچی، مولانا چشتی صاحبؒ خاص نمبر، ص: ۳۵۹

(۸) مقدمہ ہزار سال پہلے، ص: ۳۸، ۳۹

(۹) بینات، مولانا چشتی صاحب، خاص نمبر، ص: ۴۰۹

(۱۰) بینات، مولانا چشتی صاحب، خاص نمبر، ص: ۱۸۷

(۱۱) بینات، مولانا چشتی صاحب، خاص نمبر، ص: ۴۰۱۔

اپنے جہل سے واقف ہوں

مولانا عبید اختر رحمانی

اصل علم حاصل کرنے کی پہلی شرط صرف جہالت کا ہونا نہیں؛ بلکہ اپنی جہالت کا شعور ہونا ہے، بہت سے لوگ کم جانتے ہیں؛ لیکن اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کم جانتے ہیں، اس مسئلے کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی جہالت یہ نہیں کہ وہ نہ جانتا ہو؛ بلکہ یہ ہے کہ اسے اپنے نہ جاننے کا بھی علم نہ ہو۔

سقراط سے منسوب مشہور تصور بھی اسی حقیقت کے گرد گھومتا ہے کہ دانائی کا آغاز اس مقام سے ہوتا ہے، جہاں انسان اپنی علمی حدود کو پہچان لیتا ہے، اور یہی بات فارسی میں اس طرح کہی گئی ہے کہ ''معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد''، اور یہی احساس عربی کے اس مقولے میں ملتا ہے کہ ''لا اَدری نصف علم ہے''۔

انسان اپنے جہل کو کیوں نہیں پہچانتا؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسان عموماً اپنے علم کو اندر سے دیکھتا ہے، جہل کو نہیں، مثلاً کسی شخص کو تاریخ کے بارے میں دس باتیں معلوم ہیں، وہ ان دس باتوں کو بار بار اپنے ذہن میں پاتا ہے، اس لیے اسے محسوس ہوتا ہے کہ: ''مجھے تاریخ معلوم ہے''؛ لیکن اسے یہ نظر نہیں آتا کہ تاریخ کے سمندر میں وہ کتنی چیزیں نہیں جانتا، یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا ہو اور اسے یقین ہو کہ یہی پوری دنیا ہے، جب تک وہ کمرے سے باہر نہیں نکلے گا، اسے اپنے کمرے کی تنگی کا اندازہ ہی نہیں ہوگا۔

علم کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو صرف جواب نہیں دیتا؛ بلکہ نئے سوال بھی دیتا ہے؛ اسی لیے اکثر دیکھا جاتا ہے: جتنا کم علم، اتنا زیادہ اعتماد؛ اور جتنا زیادہ گہرا علم، اتنا زیادہ اپنی علمی حدود کا احساس۔

اپنے جہل کو جاننے کا پہلا طریقہ اپنے یقین پر شک کرنا ہے، ہر انسان کے ذہن میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں وہ سوچتا بھی نہیں کہ شاید یہ غلط ہوں، مثلاً: میرا مسلکی یا سیاسی فہم مکمل درست ہے، مجھے اس واقعے کی حقیقت معلوم ہے، فلاں قوم ایسی ہی ہے، فلاں تاریخی شخصیت اچھی یا بری تھی، یہ مسئلہ بہت آسان ہے وغیر ذلک۔

اپنی معلومات کو جانچنا اپنی جہالت معلوم کرنے کا پہلا سوال یہ ہونا چاہیے: میں یہ بات کیسے جانتا ہوں؟ پھر سوچیے: اس کو جاننے کا میرا ذریعہ کیا ہے؟ کیا میں نے خود تحقیق کی ہے، یا صرف کسی سے سن لیا ہے؟ کیا اس کے خلاف کوئی مضبوط دلیل موجود ہے؟ اگر کوئی مجھ سے اس کی دلیل مانگے تو کیا میں دے سکتا ہوں؟ بہت مرتبہ انسان کو اسی مرحلے پر معلوم ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو وہ علم سمجھ رہا تھا، وہ دراصل سنی سنائی بات، روایت، رائے یا تعصب تھا۔

اپنے سے بڑے عالم سے بات کرنا:

اپنی جہالت کا احساس پیدا کرنے کا شاید سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے ذہنی دائرے سے باہر نکلے، ایک اچھا عالم جب کسی بڑے عالم کی گفتگو سنتا ہے، تو اسے اپنے علم کی کمی کا احساس ہوتا ہے، ایک مورخ جب اصل تاریخی مصادر دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سابقہ علم کتنا سطحی تھا، ایک شخص جب کسی پیچیدہ مسئلے کے ماہر سے گفتگو کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ جس چیز کو میں ایک صفحے کا مسئلہ سمجھ رہا تھا، وہ تو پورا مقالہ، پوری کتاب یا لائبریری ہے؛ اس لیے انسان کو جان بوجھ کر ایسی کتابیں، ایسے افراد اور ایسے خیالات تلاش کرنے چاہئیں جو اس کے موجودہ علم کو چیلنج کریں۔

مخالف رائے کو سننا یہ ایک بہت اہم امتحان ہے، اگر آپ کو یقین ہے کہ: ''میرا موقف بالکل درست ہے'' تو اپنے موقف کے مخالف سب سے مضبوط عالم یا مصنف کو پڑھئے، کمزور مخالف کو شکست دینا آسان ہے؛ لیکن مضبوط مخالف کو سمجھنا انسان کو اپنے جہل سے متعارف کراتا ہے۔

اپنے آپ سے پوچھئے: کیا میں اپنے مخالف کے موقف کو اتنی اچھی طرح بیان کرسکتا ہوں کہ وہ خود کہے: ہاں، تم نے میری بات صحیح سمجھی ہے؟ اگر نہیں، تو ممکن ہے کہ ہم اپنے مخالف کو نہیں؛ بلکہ اس کے بارے میں اپنے ذہن میں بنائی ہوئی رائے اور موقف کو رد کر رہے ہوں،، یہ علمی دیانت انسان کے اندر ایک نئی قسم کی عاجزی پیدا کرتی ہے۔ سمجھانے کی کوشش کریں ا، پنے علم کو جانچنے کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو آپ آسان سمجھتے ہیں، اسے سمجھانے کی کوشش کریں کسی موضوع کو بغیر کتاب دیکھے ایک عام آدمی کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کریں، یہاں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ: کہاں ہماری معلومات ادھوری ہیں، کہاں اصطلاحیں تو یاد ہیں؛ مگر معنی معلوم نہیں، کہاں ہم ایک بات کو دوسری بات سے جوڑ نہیں سکتے، اور کہاں ہمارا ''علم'' صرف چند جملوں کا ذخیرہ ہے، بعض اوقات ہم کہتے ہیں: ''مجھے یہ موضوع اچھی طرح معلوم ہے''۔ لیکن جب کوئی پوچھتا ہے: ''کیسے؟ کیوں؟ اس کی دلیل کیا ہے؟ اس کے خلاف اعتراض کیا ہے؟'' تو ہمارا علم چند منٹ میں ختم ہو جاتا ہے، یہ لمحہ حقیقی علم کی ابتدا کا لمحہ ہے۔

سوالات کی فہرست بنائیے انسان اپنے جہل کو براہِ راست نہیں دیکھ سکتا؛ لیکن وہ اپنے سوالات کو دیکھ سکتا ہے، مثلاً: جس موضوع پر آپ کو لگتا ہے کہ آپ جانتے ہیں، ایک کاغذ پر لکھیں: میں اس موضوع کے بارے میں کیا کیا جانتا ہوں؟ پھر لکھیں: مجھے اس موضوع کے بارے میں کیا کیا معلوم نہیں؟ اور پھر: مجھے یہ بھی کہاں معلوم نہیں کہ مجھے کیا معلوم نہیں؟ یہ آخری سوال سب سے اہم ہے، مثلاً آپ کا خیال ہے کہ آپ کو اسلامی تاریخ کا علم ہے، خود سے پوچھئے: کن صدیوں کی؟ کن علاقوں کی؟ کن بنیادی مصادر سے؟ کس مکتبِ تاریخ نگاری کے مطابق؟ کیا آپ

کو ان مصادر کے اختلافات معلوم ہیں؟ کون سے اہم واقعات کے بارے میں مورخین کا اختلاف ہے؟ اب احساس ہوگا کہ ''اسلامی تاریخ معلوم ہے'' کہنا کتنا بڑا اور مبہم دعویٰ تھا۔

سوالوں کی تعداد کم علم آدمی کو عموماً بہت کم سوال ہوتے ہیں، اسے ہر چیز صاف دکھائی دیتی ہے: یہ صحیح ہے، یہ غلط ہے، یہ اچھا ہے، یہ برا ہے، یہ مسئلہ آسان ہے؛ لیکن جیسے جیسے انسان گہرائی میں جاتا ہے، سوال پیدا ہوتے جاتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ زیادہ سوال ہمیشہ زیادہ علم کی علامت ہوں؛ لیکن گہرے سوال پیدا ہونا عموماً اس بات کی علامت ہے کہ انسان سطح سے بلند ہو رہا ہے۔ ''میں جانتا ہوں'' کا فریب انسان کو اپنے آپ سے وقتاً فوقتاً پوچھنا چاہیے: کیا میں واقعی جانتا ہوں، یا مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ دوسروں نے کیا کہا ہے؟ مثلاً کسی کتاب کا نام معلوم ہونا، اس کے مصنف کا نام معلوم ہونا اور اس کے مرکزی خیال کے بارے میں دو جملے جان لینا، یہ اس کتاب کا علم نہیں ہے، اسی طرح کسی عالم کا نام جاننا اس کے موقف کو جاننا نہیں ہے، کسی نظریے کی تعریف یاد ہونا اسے سمجھنا نہیں ہے، کسی واقعے کی تاریخ معلوم ہونا اس کے اسباب کو سمجھنا نہیں ہے، کسی آیت یا حدیث کا یاد ہونا اس کے تمام معانی اور دلالات کا اور فقہی و مسلکی اختلاف کا علم نہیں ہے، انسان کو نعرہ اور حقیقی فہم کے درمیان فرق کرنا سیکھنا چاہیے۔

اپنے جہل کو معلوم کرنے کا عملی طریقہ ہر ہفتے کسی ایک موضوع کے بارے میں لکھیے: میں کیا جانتا ہوں؟ صرف وہی لکھیں، جسے آپ دلیل یا مثال کے ساتھ سمجھا سکتے ہوں، پھر لکھیے: میں کیا نہیں جانتا؟ اس کے تحت ان سوالات کو لکھیں جن کا جواب آپ کے پاس نہیں، پھر لکھیے: مجھے کن باتوں پر غیر معمولی یقین ہے؟ پھر ان میں سے ایک بات کے خلاف دلیل تلاش کریں، پھر تلاش کیجیے کہ میری معلومات کا اصل ذریعہ کیا ہے؟ کتاب؟ استاد؟ سوشل میڈیا؟ سنی سنائی بات؟ ذاتی مشاہدہ؟ پھر سوچیے کہ اس موضوع کا سب سے بڑا ماہر مجھ سے کیا سوال پوچھ سکتا ہے؟ یہ سوال بہت مفید ہے، اس سے فوراً علم کے خالی مقامات سامنے آتے ہیں، اس پورے مسئلے کا خلاصہ ایک خوب صورت ترتیب میں یوں ہے: جہل۔ بے خبریِ جہل۔ سوال۔ شک۔ تحقیق۔ علم۔ مزید جہل کا انکشاف۔ مزید سوال۔ مزید علم۔ یعنی عجیب بات یہ ہے کہ حقیقی علم انسان کے جہل کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے جہل کی نئی وسعتیں بھی کھولتا ہے، اس لیے شاید ایک سچے طالبِ علم کی سب سے اہم عادت یہ ہونی چاہیے کہ وہ کسی بھی موضوع پر فوراً یہ نہ کہے: ''مجھے معلوم ہے'' بلکہ کہے: ''مجھے اتنا معلوم ہے؛ باقی مجھے معلوم نہیں''، یہ جملہ دراصل جہالت کا اعتراف نہیں؛ بلکہ علم کی ابتدا ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سیف اللہ حقانیؒ

چند یادیں اور سوانحی خطوط

مولانا حافظ عرفان الحق حقانی

دارالعلوم حقانیہ کے رئیس دارالافتاء معہد الافتاء والقضاء کے سربراہ، فقاہت کی دنیا کے نامور شہسوار، جامع المعقول والمنقول قصیدہ بردہ کو خاص ترنم کیساتھ پڑھنے والے نامور عالم دین، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق قدس سرہٗ کے تلمیذ خاص، حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی فرید قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز، قدیم حقانی فرزند ''مفتی الثقلین'' کے لقب سے مشہور دارالعلوم حقانیہ میں ۴۱ برس تک علمی روشنی بکھیرنے والے عظیم شیخِ وقت، شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی سیف اللہ حقانیؒ طویل علالت کے بعد عیدالاضحیٰ کی تیسری رات ۱۲ اور ۱۳ ذوالحجہ کے درمیانی شب ڈیڑھ بجے پشاور کے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ ان کی رحلت کی خبر علی الصباح ایک فاضل حقانیہ کے توسط سے ملی تو حد درجہ غم میں ڈوب گیا، ابھی ہم شہید شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس حقانیؒ کے غم سے فارغ نہیں ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے جید شیخِ وقت سے بھی محروم ہو چلے۔ علمی زبوں حالی کے اس دور میں ان جیسے اکابر کا وجود امت کے لئے برکتوں کا گنجینہ تھا۔ قرب قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم دنیا سے اٹھالیا جائے گا اور اس کے اٹھنے کی کیفیت یہی بیان کی گئی ہے کہ اہل علم پے در پے اٹھتے چلے جائیں گے۔

معقولات کے اعلیٰ کتب پڑھانے کیلئے تقرر: مفتی صاحبؒ نے ساری زندگی علم اور دین کی ترویج واشاعت میں صرف کی۔ مفتی صاحبؒ بارعب ودبنگ شخصیت کے مالک تھے، جرأت وبیباکی، حق گوئی اور استقامت آپ کے خصوصی اوصاف تھے، دارالعلوم حقانیہ میں آپ کا تدریسی تقرر حضرت مولانا فضل المولیٰؒ کی علیحدگی اور صدر المدرسین مولانا عبدالحلیمؒ زروبویؒ کی رحلت کے بعد معقولات کے اعلیٰ کتب پڑھانے کیلئے کیا گیا تھا، منطق وفلسفہ اور حکمت کے کتب پر آپ کو خاص دسترس حاصل تھی۔

جلالی شان کے حامل ہونے کے باوجود طبیعت میں خوش طبعی کا عنصر بھی شامل تھا، مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی علمی عظمت کے معترف ہونے کیساتھ ساتھ ان کے سیاسی نظریے کی ہمیشہ حمایت کرتے رہے، گزشتہ پندرہ برس سے فالج کا عارضہ رہا جس کی وجہ سے وہیل چیئر پر درس گاہ ودارالافتاء آمد ہوتی تھی۔

علالت کے باوجود تدریسی اور دارالافتاء کی ذمہ داریاں نبھانا: میں بعض اوقات طبیعت اور حالات کا پوچھتا تو فرماتے کہ یہی حال ہے جو تمہارے سامنے نظر آرہا ہے، میں انہیں عرض کرتا حضرت اس حالت پر بھی شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فالج کی بیماری کے باوجود آپ کو تدریسی اور دارالافتاء کی ذمہ داریوں کا حامل ٹھہرایا ہے۔ اس بات سے ان کی طبیعت کھل جاتی، میں مزید تشفی کیلئے عرض کرتا کہ آپ کے اور ہمارے شیخ حضرت مولانا مفتی محمد فریدؒ تو فالج کے حملہ کے بعد تدریس کے بالکل قابل نہ رہے لیکن آپ کو اللہ تعالیٰ نے بحال فرمایا اس پر بشاشت کا اثر چہرے پر اور بھی پھیل جاتا۔

راقم کا تلمذ کے دوران استفادہ شدہ کتب: راقم الحروف نے دوران طالبعلمی آپ سے شرح عقائد، سراجی، بیضاوی شریف، مسلم شریف جلد دوم اور ابوداؤد شریف جلد دوم میں استفادہ کیا تھا۔ دوران تدریس آپ کی یہ مستقل عادت تھی کہ کلاس میں آتے ہی قصیدہ بردہ شریف کے چند اشعار خوش آوازی اور ترنم کیساتھ پڑھتے۔ درود والے اشعار،

مولای صل وسلم دائما ابداً　　علیٰ حبیبک خیر الخلق کلهم

هو الحبیب الذی ترجیٰ شفاعتهٗ　　لکل هول من الاهوال مقتحم

سب طلباء آپؒ کے ساتھ مل کر پڑھتے تھے۔

مفتی صاحبؒ کے کہنے پر معقولات کیلئے دوسرے استاذ کا تقرر: راقم جب درجہ سادسہ میں پڑھ رہا تھا تو ایک دفعہ مجھے دارالافتاء بلا کر فرمایا کہ میرے دانت دیکھ لو ٹوٹ گئے ہیں بڑھاپے کے آثار بڑھ گئے ہیں اب یہ معقولات کے کتب پڑھانے مشکل ہیں۔ یہ پڑھانا لوہے اور فولاد کے دانے چبانے کی مانند ہیں لہٰذا مہتمم صاحب کو عرض کردو کہ کسی دوسرے استاذ کا انتخاب کرلو، میں نے تیس پینتیس سال سے فراغت کے بعد پڑھا لئے اب مجھ سے یہ سارے پڑھائے نہیں جاتے، میں نے ان کی بات سن کر عم مکرم مولانا سمیع الحق شہیدؒ کو بتادی۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ دارالعلوم حقانیہ کے جید فاضل حضرت شیخ الحدیث مولانا نصیب خان شہیدؒ کا تقرر کیا جائے۔

مولانا اظہار الحقؒ کی چال اپنے والد مولانا عبدالحقؒ سے مشابہ: نومبر ۲۰۱۴ء میرے والد ماجد حضرت مولانا اظہار الحق قدس اللہ سرہٗ کا ایکسیڈنٹ ہوا اور پھر جب طبیعت بحال ہوئی تو میں گاہے گاہے قدیم دارالتدریس میں واقع دفتر اہتمام ان کو سہارے کے ساتھ لاتا، لے جاتا تھا تو مجھے خوب یاد ہے کہ مفتی صاحبؒ نے ایک دن

باوجود علالت وفالج کے وہ کھڑے ہوکر میرے والد کے پاس آئے اور فرمایا کہ آج جب آپ چل رہے تھے تو میں بغور دیکھ رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ تشریف لا رہے ہیں یعنی شیخؒ اور آپ کی چال یکساں اور مشابہ ہے الولد سر لابیہ۔ گویا بیماری کے عالم میں بھی وہ گرد وپیش کے ہر شئے پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ دوسری طرف اپنے شیخ بانی دارالعلوم کی ہر ادا ذہن پر نقش تھی۔

شادی کے دن مجھے بہتر لباس کی تلقین: فروری ۲۰۰۶ء میں راقم الحروف کی شادی ہوئی تو شام کو میرے بیٹھک (حجرے) پر تشریف لاکر خصوصی طور پر تبریک کے حوالہ سے نشست فرمائی، مجھے عام لباس (جو غالباً گرم کالا سوٹ تھا) ملاحظہ فرما کر کہا کہ یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟ نئے خوبصورت کپڑے پہنو، تم دولہا ہو، یہ اتنی سادگی بھی نامناسب ہے۔ گویا خانوادہ حقانی کے ساتھ خلوص ومحبت اس حد تک کہ ہم اصاغر کی ہیئت کذائی کی خوب نظر آنے پر خوش ہوتے اور اس میں کمی کے روادار نہ تھے۔

امتحانات سے ایک ہفتہ قبل طلباء کو تیاری کیلئے دینا: مفتی صاحبؒ اساتذہ کی تعلیمی اجلاسوں میں ہمیشہ یہ تجویز دیتے تھے کہ ہمارے طلبائے کرام کے اچھے نمبرات وفاق کے امتحانات میں اس لئے بھی نہیں آتے ہیں کہ پرچوں سے پہلے ہم ان کو تیاری کا موقع نہیں دیتے ہیں پرسوں ترسوں امتحانات شروع ہوتے ہیں ادھر ہم کورس ختم کررہے ہوتے ہیں لہٰذا کم ازکم امتحانات سے پہلے ایک ہفتہ تیاری کیلئے فارغ ہونا چاہیے، اگر پندرہ دن ہوتو یہ تو زیادہ بہتر ہوں گے۔

کثرت اولاد اور تکثیر المجاہدین کے علمبردار: مفتی صاحبؒ درس میں کثرت اولاد پر زیادہ زور دیتے اور موجود جدید دنیا کے نعرہ ''بچے دو ہی اچھے'' اس کی خوب تردید کرتے اور فرماتے کہ میری جماعت کا نام ہے انجمن تکثیر المجاہدین یعنی جتنی امت بڑھے گی اتنے ہی مجاہدین کفر کے مقابل برسرِ پیکار ہوں گے، نرینہ اولاد کے خواہش مندوں کیلئے اکثر اوقات یہ مجرب عمل بتاتے تھے کہ جب بھی بیوی کا حمل ہو یہ عزم کرلو کہ میں اس حمل کا نام محمد رکھوں گا اللہ تعالیٰ بڑے غیرتی ذات ہے وہ اس نام کی لاج رکھتے ہوئے اس حمل کو مذکر بنادیتا ہے، فرماتے کہ میں نے بھی یہ تجربہ کیا ہے اور اب میرے ایک بیٹے کا نام محمد ہے۔

دارالعلوم حقانیہ کا مہمان خانہ مفتی صاحبؒ کیلئے رہائش گاہ: مولانا سمیع الحق شہیدؒ مفتی صاحبؒ کی خصوصی قدردان تھے، یہی وجہ تھی کہ اساتذہ کے پرانے مکانات گراکر دارالعلوم کے عقب میں دارالمدرسین بنایا گیا تو اس کی تعمیر کچھ یوں جدید انداز سے کی گئی کہ اس میں کھلا آسمان نظر نہیں آتا تھا یعنی شہری انداز سے بند گھر

تھے، اس پر مفتی صاحبؒ نے نئے مکانات میں جانے سے انکار کر دیا تو مولانا سمیع الحق شہیدؒ نے مفتی صاحبؒ کو دارالعلوم حقانیہ کا مہمان خانہ بطور رہائش دینے کے احکامات صادر فرمائے، مہمان خانہ جو کہ ایک بنیادی ضرورت تھی اسے ختم کر کے ایک استاذ کی ضرورت اور طبعی تقاضے کو مقدم کرنا یہ مہتممین حضرات کے لئے ایک بڑا اہم سبق ہے کہ اجتماعی ضرورت کو بھی بعض اوقات ایک استاذ کیلئے پس پشت ڈال دو، **فیا للعجبا** اسے بھی **ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ** کا ایک مظہر کہا جا سکتا ہے۔ بعد میں جب حقانیہ کی جدید مسجد کی تعمیر کے لئے مہمان خانے کو گرانا ناگزیر ہو گیا تو تب ہی مفتی صاحبؒ دارالمدرسین کے دوسرے بلاک میں بامر مجبوری منتقل ہو گئے۔

مفتی صاحبؒ نے اکوڑہ خٹک کے مدرسے میں اکتالیس برس کا طویل عرصہ تدریس اور عوام کی شرعی رہنمائی کیلئے دارالافتاء میں خدمات انجام دیئے، بڑے بڑے صاحب ثروت آپ کے تلامذہ اور معتقدین میں شامل ہیں لیکن ان سے دنیاوی مفاد لینے کے روادار نہ تھے اس حد تک کہ اکوڑہ خٹک میں مرتے دم تک آپ نے دارالعلوم حقانیہ کے عاریتی کوارٹر میں زندگی گزاری۔ میں کبھی کبھی ان کے فرزندوں کو اس طرف متوجہ کرتا کہ کم از کم یہاں چند مرلے کا پلاٹ لے کر اس پر اپنے لئے گھر بنانے کا منصوبہ بناؤ، کب تک اس طرح دو تین کمروں کے گھر میں گزارہ کرتے رہو گے؟ مفتی صاحبؒ نے کثرت عیال ہونے کی بناء پر بچوں کی شادیاں کروا کر اکوڑہ خٹک میں کرایہ کے مکانات میں بھجوا دیا۔ مطلب یہ کہ ساری زندگی قوت لایموت پر گزر اوقات کرتے رہے۔ جو میسر آیا اسے زندگی گزارنے میں صرف کر دیا، متوکل علی اللہ شخصیت کے مالک تھے۔ چھوٹا بیٹا مولانا محمد سیف مروت جو دارالعلوم حقانیہ کے فاضل اور والد کے ساتھ معہد الافتاء میں پڑھانے پر مامور رہا وہ گھر میں آپ کے ساتھ خدمت کے لئے آخر دم تک ساتھ رہا، بڑے بیٹے مولانا انور مسرور صاحب دارالعلوم حقانیہ کے فاضل اور جمعیت علماء اسلام (س) کے اپنے دور کے زبردست کارکن رہے اور مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی نظریاتی رفاقت میں عمر کا بیش تر حصہ گزارا، موصوف دارالعلوم حقانیہ میں الحق فورس اور جمعیت کے آرگن ''ترجمان دین'' کی نظامت پر مامور بھی رہے بعد ازاں گردش ایام کی بناء پر اکوڑہ خٹک بازار میں تجارت سے وابستہ ہو کر کریانہ کی دکان اور اب دو تین منزلہ کتب خانہ بنا کر اقتصادی ضروریات پوری کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ منجھلے بیٹے مولانا ظہور احمد بھی دارالعلوم حقانیہ کے فاضل، تحریر کے عمدہ ذوق کے حامل ہیں، والد صاحب کے ساتھ پڑھانے کی ذمہ داریاں بھی سر لئے ہوئے تھے جو کہ اس سال حقانیہ میں میری تحریک پر مدرس مقرر کیے گئے ہیں۔ دوسرے بیٹے ہدایت اللہ، تیسرے امداد اللہ اور پانچویں نعمت اللہ اپنے

اپنے روزگاروں میں مصروف ہیں۔

اہلیہ بھی سادگی اور خلوص کی خوگر: مفتی صاحبؒ کی اہلیہ بھی دیہاتی مزاج کی حامل سیدھی سادھی عورت تھیں، جب ہم چھوٹے تھے مفتی صاحبؒ کے بیٹے امداداللہ صاحب کے ساتھ ان کے ہاں آنا جانا رہتا، خلوص ومحبت کے ساتھ سادگی ان میں نمایاں تھی۔ چند سال قبل وہ بھی رحلت کرگئی تو انہیں آبائی گاؤں سالارخیل لے جاکر وہی دفن کیا گیا۔

نسبت کے بعد شادی میں جلدی کرنے کی ترغیب: راقم الحروف کی نسبت جب مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی دختر نیک اختر کے ساتھ ہوئی تو اس پر بڑے خوش تھے، دو چار سال تک منگنی کے بعد شادی ہونے میں لگ گئے۔ اس دوران اکثر مجھے شادی جلد کرنے کی ترغیب دیتے اور کبھی کبھی فرماتے کہ شادی میں اتنی تاخیر نہیں ہونی چاہئے، حالات پلٹتے اور بدلتے ہیں، بعض اوقات اتنی لمبی دوستیاں نہیں چلتی یعنی نیک کام میں جلدی کرکے مقصد اور ہدف تک پہنچ جانا ہی دانشمندی ہوتی ہے۔ خدانخواستہ بدخواہ لوگ بیچ میں ادھر ادھر کی باتیں کرکے تعلقات توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو موقع نہیں دینا چاہیئے یقیناً یہ مفتی صاحبؒ کی راقم کے ساتھ محبت اور خیرخواہی کا جذبہ ہی تھا اور دوسری طرف رشتوں میں دراڑ پڑنے سے بچانے کی عقل مندی اور ہوشیاری بھی تھی۔ اس زمانے میں ایسے خیرخواہ کہاں ہیں چراغ لے کر بھی ڈھونڈا جائے تو نہی ملتے ہیں۔

مولانا سمیع الحق شہیدؒ کی دعوت پر سی ٹی، بی ٹی کے متعلق مفتیان کرام کی بیٹھک: مولانا سمیع الحق شہیدؒ نے ایک دور میں جب عالمی سطح پر جنگی ہتھیاروں کی تیاری کو روکنے کیلئے بین الاقوامی معاہدے پر ملکی حکمرانوں کو سی ٹی بی ٹی پر دستخط نہ کرنے کی شرعی موقف پر ملک بھر کے چوٹی کے علماء اور مفتیان عظام کو پارلیمنٹ لاجز اسلام آباد میں واقع اپنے فلیٹ میں مدعو فرمایا تو اس موقع پر مجھے فرمایا کہ تم بھی صبح مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ قدس سرہٗ اور مولانا مفتی سیف اللہ حقانیؒ کو ساتھ لیکر اسلام آباد آؤ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہم تینوں ایک عام گاڑی میں بیٹھ کر گئے، اتنے بڑے شخصیات اور بس میں جانا یہ ہمارے اکابر کی بے نفسی اور تواضع تھی، دوران سفر مفتی سیف اللہ صاحبؒ کچھ دیر تو گفتگو کرتے رہے اور پھر اپنے بغل میں سے کچھ مسودات نکال کر اس میں تصحیح کرنے لگ گئے، میں نے پوچھا حضرت! یہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ یہ ہمارے شیخ حضرت مولانا مفتی محمد فریدؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ فتاویٰ فرید یہ ہے جس پر نظر ثانی کیلئے مجھے بھیجا گیا ہے۔ مفتی صاحب دوران سفر اپنے وقت کو قیمتی بنا کر علمی سرمایہ امت تک پہنچانے میں مصروف ہوگئے۔ یہ تھی ہمارے اکابر کے ہاں وقت کی قدردانی اور اسے جھونک جھونک کر استعمال کرنا۔ آج وقت کی قدردانی لوگوں

میں کس حد تک ہے۔ ہماری نئی نسل تو ساری جمع پونجی موبائل پر لٹا رہی ہے۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی　　گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

مفتی صاحبؒ کے سوانحی حالات کچھ یوں ہیں:

نام ونسب: مولانا مفتی سیف اللہ مدظلہ بن ہاشم خانؒ صاحب بن مدت خان بن گل احمد۔

پیدائش: ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو لکی مروت کے ایک گاؤں سالار خیل میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم: آپ کے والد صاحب نے نذر مانی تھی کہ چار بچوں میں سے ایک کو اللہ کی رضا اور دین کی خدمت کے لئے وقف کرونگا۔ چاروں بچوں میں مفتی صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اس کار خیر کے لئے چن لیا۔ دس سال کی عمر میں آپ کو لکی مروت کے مشہور قدیم مدرسہ دارالعلوم اسلامیہ میں داخل کیا گیا۔ تقریباً پانچ سال تک وہاں پڑھتے رہے۔

اعلیٰ تعلیم: فنون کی تکمیل کے لئے آپ نے دیوبند ثانی دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ لیا اور یہیں پر تکمیل فنون کے بعد دورہ حدیث پڑھی۔

فراغت: ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم حقانیہ سے فراغت حاصل کی۔

دورۂ تفسیر: حضرت مفتی صاحب نے شیخ القرآن حضرت مولانا عبدالہادی شاہ منصوریؒ سے دو بار دورہ تفسیر پڑھا۔ دورہ حدیث کی تکمیل کے بعد حضرت شاہ منصور باباؒ نے آپ کو خط کے ذریعہ مبارکباد دی اور یہ شعر لکھا.....

چہ خوش باشد کہ بعد از انتظارے　　بامیدے رسد امیدوارے

۱۹۸۶ء میں آپ نے اپنے استاد حضرت مولانا فضل مولیٰ رحمہ اللہ کی معیت میں خان پور میں حافظ القرآن والحدیث حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ سے دورہ تفسیر پڑھا۔

بیعت وارشاد: ابتداء میں آپ مرشد العلماء حضرت مولانا عبدالمالکؒ سے بیعت ہوئے اور آپ کی وفات کے بعد وظائف کی تکمیل حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد فرید سے کی۔ جس کے اختتام پر آپ کو خلافت سے نوازا گیا۔

درس وتدریس اور دارالعلوم میں تقرری: فراغت سے متصل ۱۹۷۲ء میں آپ نے دارالعلوم حسینیہ شمالی وزیر

ستان میں تدریسی زندگی کا آغاز کیا اسکے علاوہ صوبہ خیبر پختونخوا کے جنوبی اضلاع میں مختلف مدارس میں تدریس وافتاء کا کام کرتے رہے بالاخر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی خواہش اور حکم پر شوال ۱۴۰۶ھ مطابق جون ۱۹۸۶ء کو دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے اور تادم یہیں پر مصروف درس و تدریس رہے۔آپ کا ابتدائی مشاہرہ ۱۳۰۰ روپیہ مقرر ہوا۔

کتب زیر درس: معقولات کی جملہ منتہی کتب شرح عقائد، بیضاوی، ایک عرصے تک آپکے زیر درس رہیں آخری دوسال فالج کے شدید اثر کی وجہ سے آخری دوسال صرف مسلم شریف کے چند اسباق پڑھانے پر اکتفاء کرتے تھے۔

افتاء: حضرت مفتی صاحبؒ جہاں حقانیہ میں تدریسی خدمات کماحقہ سرانجام دے رہے ہیں وہاں عامۃ الناس کے لئے مسائل دینیہ کے سلسلے میں شعبہ افتاء کے گراں قدر خدمات میں بھی سرگرم عمل ہیں۔اب تک ہزاروں فتاویٰ حضرت مفتی صاحب کی نوک قلم سے نکل کر خلق خدا کی مذہبی رہنمائی کر چکے ہیں۔

فن میراث وفرائض: حضرت مفتی صاحب کو فن میراث میں خاص ملکہ حاصل ہے دارالعلوم حقانیہ میں آپ سال میں دومرتبہ دورہ میراث طویل عرصہ تک پڑھاتے جس میں سینکڑوں کی تعداد میں دور دراز سے آئے ہوئے طلباء شرکت کرتے۔

تصنیف وتالیف: کثیر ذمہ داریوں کے باوجود آپ نے تصنیف وتالیف کا کام بھی جاری رکھا کچھ تصانیف درجہ ذیل ہیں۔

(۱)انوارالمفتی علی التفسیر السیوطی (۲)انوارالفرید فی شرح ابی داؤد
(۳)انوارالباری فی شرح القاضی (۴)کشف الغطأ عن امارۃ النساء
(۵)الرسائل السبعہ وغیرہ

مشاہیر اساتذہ: حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ، حافظ القرآن والحدیث حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ، حضرت شیخ القرآن مولانا عبدالہادی شاہ منصوریؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد فریدؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا سمیع الحقؒ۔

درس نظامی کے طلبہ کرام کے لیے عربی شرحوں کی رہنمائی

مولانا عمر فاروق ڈیروی

اس وقت ایک طرف مطالعہ کا فقدان ہے تو دوسری طرف عربی کتب سے بے رغبتی کا راج، حالانکہ مطالعہ کی برکات سے انکار ممکن نہیں۔ عربی کا ایک مشہور مصرعہ ہے: خيرُ جليسٍ في الزمان كتاب یعنی کتاب سب سے بہترین ہمنشین ہے۔ اور کہا جاتا ہے: الكتب بساتين العلماء یعنی کتابیں، اہل علم کے باغات ہیں۔ وہ لوگ واقعی مبارک ہیں جنہوں نے مطالعہ کو اپنا مشغلہ بنالیا ہے۔ ایک بڑی کوتاہی یہ ہے کہ عربی کتب اور شرحوں کی طرف عدم توجہ بڑھتی جارہی ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ عربی زبان کی جو برکات اور وسعت ہے، وہ دیگر زبانوں میں نہیں۔ پیشِ نظر مختصر مضمون میں درس نظامی کے طلباء کرام کے لیے عربی کتب کی نشاندہی کی گئی ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی طور اس خلا کو پر کیا جائے یا کم از کم اہل علم کی فکرمندی کا سبب بنے۔ عربی کتب سے دوری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض طلبہ کرام یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عربی کتب کو سمجھ نہیں سکتے۔ یہی وہ غلطی ہے جس سے علمی انحطاط کا آغاز ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ ہر کام میں ترقی، تدریج اور تسلسل کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ طلبہ کرام کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ عربی شروح اور کتب کا مطالعہ کریں ان شاء اللہ ترقی ضرور حاصل ہوگی۔ اساتذہ کرام کی خدمت میں عاجزانہ گزارش ہے کہ طلباء کو عربی شرحوں کی طرف مائل کریں اور اس سلسلے میں ان کی رہنمائی فرمائیں۔ اس سے نہ صرف ان کی علمی استعداد میں اضافہ ہوگا، بلکہ اصل مصادر سے وابستگی بھی پیدا ہوگی، جو ایک طالبِ علم کے لیے نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔

اساتذہ کرام سے دوسری درخواست یہ ہے کہ درس وتدریس کے دوران سارا کام اپنے ذمہ نہ لیں، بلکہ کچھ نہ کچھ کام طلباء سے ضرور لیں۔ اس سے طلبہ کی استعداد میں پختگی پیدا ہوگی۔ مثلاً:

۱- استاذ تشریح فرمائیں اور ترجمہ کی ذمہ داری طلبہ پر ڈال دیں۔

۲- یا حواشی بیان کرنے کی ذمہ داری طلبہ کرام کے سپرد کریں۔

۳- یا اگر کوئی اشکال ہو تو اس کا جواب طلبہ کرام کے ذمہ لگا دیں کہ اگلے دن اس اشکال کا جواب مطلوب ہے۔ اس سے طلبہ میں تحقیق کا مادہ پیدا ہوگا، ان شاء اللہ۔ طلبہ کرام کے مزاج سے واقف ہر شخص کو معلوم ہے کہ طلبہ اس کام

کو بوجھ محسوس کریں گے اور شاید یہ بھی کہیں کہ یہ کام مشکل ہے۔ بہت کم طلبہ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو تھکاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی میں ان کا فائدہ ہے۔ اگر کسی ادارے میں یہ طریقہ رائج ہو جائے کہ طلبہ خود سبق پڑھیں اور استاذ صرف اس وقت رہنمائی کرے جب رہنمائی کی ضرورت ہو، تو اس سے بہت جلد استعداد میں پختگی پیدا ہوگی اور عظیم فوائد حاصل ہوں گے، ان شاء اللہ!۔

ذیل میں درجہ اولیٰ کے علاوہ اور نصاب میں شامل اردو کتب کے سوا درس نظامی کی مختلف کتب کے لیے ایک ایک عربی شرح کی نشاندہی کی جارہی ہے، اہل علم حضرات ملاحظہ فرما کر اپنی قیمتی آراء سے بھی آگاہ فرمائیں۔

درجہ ثانیہ:

1: قدوری کے لیے "اللباب في شرح الكتاب" عمدہ کتاب ہے، نیز مولانا عاشق الٰہی رحمہ اللہ کی "التسهيل الضروري" بھی درجہ ثانیہ کے مستوی کے لحاظ سے بہترین ہے۔ 2: "هداية النحو" کے لیے "دراية النحو" عمدہ کتاب ہے۔

درجہ ثالثہ:

1: کنز الدقائق کے لیے تبیین الحقائق عمدہ شرح ہے۔ 2: کتاب أصول الشاشي کو سمجھنے اور حل کرنے کے لیے حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمہ اللہ کی عربی تصنیف تسهيل أصول الشاشي نہایت عمدہ ہے۔ 3: کافیہ کے لیے آس اکیڈمی لاہور کے استاذ مولانا فرمان حیدر صاحب کا حاشیہ الوافية في معرفة ما في الكافية عمدہ ہے۔ 4: شرح التهذيب کے لیے تهذيب التهذيب بہترین حاشیہ ہے۔ 5: "عقیدہ طحاویہ" کے لیے حضرت مولانا مفتی عبید الرحمن صاحب مدظلہ کی تازہ تصنیف الكواكب الدراري في شرح عقائد الطحاوي بہترین کتاب ہے۔

درجہ رابعہ:

1: شرح جامی کے لیے حاشیہ محرم آفندی بہترین ہے۔ 2: نور الأنوار کے لیے اس کے دو مفید حاشیے ہیں: قمر الأقمار اور سرّ الأسرار۔ دونوں حل کتاب کے لیے نہایت مفید ہیں۔ 3: مقامات حریری کے لیے شرح الشريشي على مقامات الحريري اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ علیہ کا حاشیہ قابل مطالعہ ہیں۔

درجہ خامسہ:

1: "ہدایہ" کے حل کے لیے بہترین کتاب علامہ عینی کی البنایۃ ہے۔ اور ساتھ علامہ عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ کا حاشیہ اپنے اندر اختصار کے ساتھ جامعیت اور افادیت سموئے ہوئے ہے۔ 2: مختصر المعانی کے لیے حاشیہ شیخ الہند کافی ہے، کوئی باذوق چاہے تو دسوقی کے اصل حاشیہ کو بھی سامنے رکھے۔ 3: دیوان المتنبي کے لیے شرح الواحدی

على ديوان المتنبي عمدہ شرح ہے۔4: سبع معلقات کے لیے شرح الزوزنی علی المعلقات السبع عمدہ کتاب ہے۔

درجہ سادسہ:

1: تفسیر الجلالین کے لیے ترويح الأرواح بہترین کتاب ہے۔2: شرح العقائد کے لیے النبراس مفید ہے۔3: دیوان حماسہ کے لیے شرح المرزوقي على ديوان الحماسة عمدہ ہے، نیز شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی رحمہ اللہ کا حاشیہ بہترین ہے۔4: السراجي کے لیے خود سراجی کے مصنف کا تحریر کردہ شرح شمسیہ بہتر ہے۔

درجہ سابعہ:

1: تفسیر البیضاوي کے لیے مولانا عبدالرشید جلال آبادی مدظلہ کا حاشیہ لاجواب ہے۔2: "مشکوٰۃ المصابیح کے لیے مرقاة المفاتيح بہترین کتاب ہے، لیکن قدرے طویل ہے، دوسرے درجہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی لمعات التنقيح مناسب ہوگی۔

دورہ حدیث:1

: بخاری شریف کے لیے فتح الباري اور عمدة القاري بہترین شرحیں ہے۔2: مسلم شریف کے لیے امام نووی رحمہ اللہ کی مایہ ناز شرح المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج کافی ہے۔3: ترمذی شریف کے لیے منهاج السنن اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی معارف السنن عمدہ شرحیں ہے، اور حضرت رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کی الكوكب الدري شرح جامع الترمذي گویا دریا بکوزہ کا مصداق ہے۔4: ابوداود شریف کے لیے بذل المجهود بہترین کتاب ہے۔5: شرح معانی اُلآثار کے لیے حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ کی مختصر اور جامع تصنیف اپنے نام کی طرح نثر الأزهار لاجواب ہے۔6: شمائل ترمذی کے لیے مولانا فیض الرحمن حقانی مدظلہ کی کتاب نفح العرف الشذي عمدہ شرح ہے۔مزید تفصیل کے لیے ملا علی قاری رحمہ اللہ کی شرح جمع الوسائل مناسب ہے۔7: موطا امام محمد کے لیے علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ کی التعليق الممجد على موطأ محمد بہترین حاشیہ ہے۔8: سنن ابن ماجہ کے لیے شیخ عبدالغنی مجددی رحمہ اللہ کا حاشیہ إنجاح الحاجة اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کا حاشیہ مصباح الزجاجة دونوں مفید ہیں۔ربنا تقبلنا إنك أنت السميع العليم، وتب علينا إنك انت التواب الرحيم۔

شرح مکتوبات امام ربانی

شارح: مولوی نصر اللہ ہوتکی۔ ترجمہ، تخریج وتعلیقات: ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا۔ صفحات: جلد اول: 664۔ جلد دوم: 436۔ طباعت: عمدہ۔ قیمت: 2800 روپے۔ ملنے کا پتا: خانقاہ سراجیہ نقشبندیہ مجددیہ کندیاں ضلع میانوالی۔ رابطہ نمبر 03006090543

جناب ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا صاحب زید مجدہم باہمت انسان ہیں۔ گوشۂ عزلت میں رہتے ہوئے ایسا قابلِ قدر کام کر رہے ہیں کہ دیکھ کر اور سن کر رشک آتا ہے۔ ہر دو چار مہینے بعد سلسلہ نقشبندیہ کے تعلق سے کوئی نہ کوئی قدیم کتاب ڈاکٹر صاحب کے ترجمے، تحشیے، ترتیب وتدوین کے بعد نئی آب وتاب کے ساتھ منظرِ عام پر آجاتی ہے۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْد!

زیرِ نظر کتاب ''شرح مکتوبات امام ربانی'' حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکتوبات گرامی کی فارسی شرح ہے۔ اور شارح اپنے وقت کے جید اور خدا ترس عالم مولانا نصر اللہ ہوتکی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے شہرۂ آفاق مکتوبات علوم ومعارف اور تحقیقات وتدقیقاتِ تصوف کا بے مثل گنجینہ ہے۔ مکتوبات کا یہ گنجینہ پچھلی چار صدیوں سے تشنگانِ علومِ تصوف کو سیراب کر رہا ہے۔ ان مکتوبات میں کلام، عقائد اور سلوک واحسان، انکشاف حقیقت کعبہ، حقیقت قرآن مجید، حقیقت صلوٰۃ، معبودیت صرفہ، مشارب اولیاء، درجات محبت، کے اسرار ورموز کا سیر حاصل احاطہ کیا گیا ہے۔ فاضل شارح مولانا نصر اللہ ہوتکیؒ نے مغلق اور عام سطح سے بلند علوم ومعارف کی شرح کی ہے اور بعض مقامات پر مزید توضیح کو بھی عمدہ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، مکتوبات کی تھوڑی سی عبارت ''حضرت امامؒ می فرماید'' اور کبھی ''وآنچہ می فرماید'' کے عنوان کے ساتھ تحریر کرنے کے بعد اس کے تحت آمدہ بیان یا گفتگو ومطلب کی تشریح کرتے ہیں اور جہاں کہیں ضرورت محسوس کی وہاں ''تبصرہ'' اور ''تذکرہ'' کے عنوان سے مزید تشریح وتوضیح کرتے ہیں۔

خاص وعام میں بہت سے حضرات مکتوبات شریف کے بعض مشکل مقامات، اصطلاحات اور عبارات کو سمجھنے میں اکثر دِقت کا شکار رہے ہیں۔ شارحؒ نے شریعت وطریقت اور سلوک ومعرفت کے ساتھ گہری وابستگی کے پیشِ نظر اِن مشکلات کا حل دِلکش اور نہایت آسان پیرائے میں بیان کیا ہے۔

یہ شرح چونکہ فارسی زبان میں ہے اور ہمارے ہاں فارسی دانی کا ذوق عنقا ہو چکا ہے اس لیے اس شرح کے ترجمے کا بیڑا جناب ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا صاحب نے اٹھایا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ شارح مولانا نصر اللہ ہوتکی رحمہ اللہ کی اس

شرح کا ترجمہ اب عام وخاص سب کے لیے یکساں مفید ہے۔سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے وابستگان اور سلاسل تصوف سے وابستہ حضرات کے لیے انمول تحفہ ہے۔

خطبات اہل السنۃ

مؤلف: مولانا محمد رضوان عزیز کوہاٹی۔صفحات: 221۔ قیمت: لکھی نہیں۔ ملنے کا پتا: مکتبہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کوہاٹ۔رابطہ نمبر:03362167838

زیر نظر کتاب اصلاً سال بھر پہ محیط عربی خطبات جمعہ کا مجموعہ ہے۔آغاز میں فاضل مؤلف نے خطبہ جمعہ کے احکام کو بھی جمع کر دیا ہے۔فاضل مؤلف لکھتے ہیں کہ عربی خطبات میں مسلک احناف دیوبند کے عقائد ومسائل، اصلاحِ معاشرہ اور بدعات واہل باطل کے فتنوں کا دلائل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔خطبات کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ خطباء حضرات کم وقت میں جامع، شریعتِ مطہرہ سے ہم آہنگ اور فتنوں کے مقابل مضبوط خطبہ بہ آسانی تیار کر سکیں۔یہ کتاب اس لحاظ سے عمدہ کاوش ہے کہ خطباء حضرات ان خطبات کی مدد سے جمعہ کی تقریر تیار کر سکتے ہیں اور تقریر کے مشمولات کو عربی خطبہ میں دلائل کے ساتھ ذکر کر سکتے ہیں۔کتاب کا پورا نام: ''خطبات اھل السنۃ مع الردّ علی اھل البدعۃ'' ہے۔

حافظ محمد عبداللہ، حیات وخدمات

مولف: مولانا سفیر احمد ثاقب۔صفحات: 480۔ قیمت: لکھی نہیں۔ ملنے کا پتا: مکتبہ عثمانیہ اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی رابطہ نمبر:03335141413

حضرت مولانا حافظ محمد عبداللہ رحمہ اللہ آزاد کشمیر کی ایک فیض رَساں، باخدا شخصیت تھے۔آپ مدرسہ تعلیم القرآن باغ؛ آزاد کشمیر کے مدیر رہے۔اس مدرسہ نے آزاد کشمیر میں دینی تعلیمات کے فروغ اور نشر واشاعت میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔آپ کی پیدائش 1930ء میں ''باغ'' کے ایک گاؤں ''پنیالی'' میں ہوئی، آپ کشمیر کی معروف روحانی شخصیت حضرت سائیں محمد اکبر خان رحمہ اللہ کے تیسرے بیٹے تھے۔حضرت سائیں محمد اکبر خانؒ ہی وہ شخصیت تھے جنہوں نے باغ میں ''دارالعلوم تعلیم القرآن'' کی بنیاد رکھی۔حضرت حافظ محمد عبداللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ، پھر ہری پور اور اس کے بعد دارالعلوم ٹنڈوالہ یار میں حاصل کی، دورہ حدیث خانپور میں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی نوّر اللہ مرقدہ کے پاس کیا۔ارادت کا تعلق شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ سے تھا۔حافظ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے والد سائیں محمد اکبر خان کے قائم کردہ مدرسہ کو سنبھالا اور اسے ترقی دی۔مدرسہ کے انتظام وانصرام کے دوران

بعض ناگفتہ بہ حالات بھی پیش آتے رہے، لیکن انہوں نے مشکل حالات کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ مولانا سفیر احمد ثاقب صاحب زید مجدہ جو حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ کے قریبی عزیز ہیں؛ نے حافظ صاحب رحمہ اللہ کی حیات وخدمات پر یہ مبسوط کتاب تالیف کی ہے۔

اس طرح کی کتابوں میں محض شخصی احوال نہیں ہوتے بلکہ شخصیت کے زمانے کے احوال واقعات بھی جگہ پاجاتے ہیں، اور بعض تاریخی احوال بھی قلمبند ہوجاتے ہیں۔ مولانا سفیر احمد ثاقب صاحب نے کئی مقامات پر حواشی تحریر کرکے اس کتاب کو تاریخی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔ اس طرح یہ کتاب اہل ذوق کے لیے لائق اعتناء وقابل مطالعہ مجموعہ بن گئی ہے۔ علاقائی شخصیات کے حوالے سے تعارف کا ذوق رکھنے والے احباب کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے۔

تذکرہ علماء رفتگان

تالیف: مولانا حافظ اکبر شاہ صاحب بخاری۔ صفحات: 615۔ قیمت: لکھی نہیں۔ ملنے کا پتا: ادارہ اسلامیات مال روڈ لاہور۔ رابطہ نمبر 03245773262

ہمارے پاکستان میں مولانا حافظ محمد اکبر شاہ صاحب زید مجد ہم علماء دیوبندی اکابر وعلماء خصوصاً سلسلہ تھانوی کے اکابر ومشائخ علماء کرام کا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اکابر علماء ومشائخ دیوبند سے محبت آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ آپ کی اکثر تصانیف کا محور بھی شخصیات دیوبند ہیں۔ زیر نظر کتاب ''علمائے رفتگان'' میں عظیم علمی، روحانی شخصیات کے تذکروں کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں 1965ء سے 2025ء تک کے ان علمائے رفتگان کا تذکرہ شامل ہے جنہیں مولانا اکبر شاہ صاحب زید مجد ہم نے دیکھا، یا ان سے عقیدت ومحبت کا تعلق رہا۔ یہ کل 205 شخصیات ہیں۔ ان میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ، مولانا سید بدر عالم میرٹھی، مولانا خیر محمد رحمہ اللہ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، اور دیگر نامور شخصیات شامل ہیں۔ ان میں ایسی شخصیات کا تذکرہ بھی شامل ہے جو بہت نامور اور شہرت یافتہ نہیں تھیں مگر انہوں نے اپنے اپنے مقام پر گراں قدر علمی، روحانی، دعوتی اور معاشرتی خدمات انجام دیں۔ یوں یہ ایک ہی مجموعہ اکابر ومشائخ دیوبند کے تعارف کا خوب صورت مجموعہ بن گیا ہے۔ اہل ذوق کو اس کتاب سے ضرور اعتناء کرنا چاہیے۔